جنوری ۱۹۱۰ء

جلد - ۱۹
نمبر - ۴

مخزن

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

فہرست

کہ خدا کی طرح یہ بھی محض معقولی چیز ہے۔ یہ سنکر کندۂ ناتراشیدہ کہنے لگا میں
بالفعل تمکو نقطہ سے مباحث رکھوں گا لعنت بر شدا تو بڑی پر عجیب ہے۔ آپ نے بہت احمق
نے نقطہ سے کیوں سشرح وبعات کی۔ اتنا تو حفظ مراتب کیا ہوتا کہ تم اس درجہ
پر کب پہنچتے تہے کہ نقطہ کو سمجہ سکو۔ مینے اپنے دل میں کہا کہ یہ نشد و دشد
یہ کم بخت تو مجہے گنوار جاہل فرض کیے لیتا ہے۔ خلیفہ کے دار الانشار
کا تمام انتظام تو میری رائے پر محمول ہے اور یہ کہتا ہے کہ تم نقطہ کا مفہوم
نہیں سمجہ سکتے۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ اچھی طرح اسکی عقل کے ناخن لواؤں
مگر حلم کہتا تھا کہ اس بے ادب دریدہ دہن کی بات پر نہ جاؤ اپنے علم و فضل
کی طرف دیکہو۔ میں پیچ و تاب ہی میں تھا کہ اوس نے اپنے غلام کو کچہ
اشارہ کیا۔ غلام اس بلا کا پہرتیلا اور چابکدست تھا کہ حکم کی دیر تھی فوراً ایک
بدصورت بدوضع بکس نما چیز لاکر حاضر کردی۔ چونکہ میری سمجہ میں کچہ نہ آیا کہ یہہ کیا
اور کس مصرف کی چیز ہے میں اوسپر اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر نظر
دوڑاتا تھا اور پہر سر نیچا کرکے دریائے تفکر میں غوطے لگاتا تھا۔
کہ آخر معلوم تو ہو یہ ہی کیا بلا۔ پہلے صندوق کا گمان پہر صندوقچہ کا
دہوکہ ہوا آخر تابوت کا خیال آیا اور مینے اپنے دل کو یوں سمجہا لیا کہ ملحد
کی لحد اور بے ایمان کی قبر ہے کہ لوگوں کو راہ راست سے بہکا کر اسمیں
لا دہکیلتا ہے۔ اتنے میں اوس نے ایک بڑی موٹی لٹھہ سلائی اپنی آستین
سے نکالی۔ میں حیران کہ الٰہی یہہ کیا معاملہ ہے کیا یہ شخص کوئی نیم طبیب
خطرہ جان ہے۔ آخر نرہا گیا اور مینے اوس سے کہا تیری جو بات ہے عجیب ہے
جو ادا ہے دنیا سے نرالی ہے ایسے سلائی تو مینے آج تک کسی طبیب
کے پاس نہیں دیکھی۔ غالباً آنکھیں پہوڑنے میں کام آتی ہوگی۔

کہنے لگا میں طبیب نہیں ہوں بلکہ اِس کے ذریعے سے اشکال ہندسی اِس مکس پر
کھینچتا ہوں۔ مینے کہا گو تو مذہب میں نصرانی کا مخالف ہے مگر کفر میں اوسکا
شریک وموافق معلوم ہوتا ہے کیا تیرا یہ مطلب ہے کہ روشنی روز کو تاریکی شب
سے بدلدے اور مجکو لوح محفوظ اور کراماً کاتبین سے انکار کی ترغیب دے
کیا تونے مجھے واقعی ایسا بے وقوف سمجھ لیا ہے کہ تیرے ہتکھنڈوں سے
میرا پائے اعتقاد ڈگمگا جائے۔ اسپر کندۂ دوزخ کیا بکتا ہے کہ مجھے نہ لوح
سے غرض نہ کسی کاتب کریم ولئیم سے، میرا کام تو اشکال ہندسی کھینچنا اور
اون کو دلائل عقلی سے ثابت کرنا ہے۔ اتنا کہکر ادہر تو اوس نے
لکھنے کا ارادہ کیا اودہر میری یہ کیفیت ہوئی کہ دل دہڑکنے لگا کہ خدا
خیر ہی کرے۔ اوس میں اتنی سمجھ کہاں کہ شاگرد کی رغبت یا بے میلی کا خیال
کرے۔ جھٹ ایک لکیر کھینچکر نہایت وثوق اور فخر کے ساتہ بولا کہ دیکھو
خط لمبائی بغیر چوڑائی کا نام ہے جیسے یہ لکیر۔ یہ سنتے ہی صراط مستقیم میری
آنکھوں میں پہر گئی اور جلکر اوس سے کہا کہ خدا تجہ سے سمجھے کم بخت سمجھتا بہی ہے
یا یونہیں جو منہ میں آتا ہے بک دیتا ہے۔ کیا اِس لکیر کو صراط مستقیم بتا کر لوگوں
کو راہِ راست سے بہکانا چاہتا ہے۔ صراط مستقیم کہاں اور یہ خط کہاں۔
صراط مستقیم تو تلوار کی دہار سے زیادہ تیز، بال سے زیادہ باریک اور ہر ایک
چیز سے جسکو تم ناپ سکتے ہو زیادہ لانبی ہے۔ کیا تجھے امید ہی کہ تیری
لکیر کا فقیر ہوکر میں راہِ خدا سے منحرف ہوجاؤں گا یا تونے مجھے ایسا سادہ
لوح خیال کر لیا ہے کہ تیرے چکنے چپڑے لفظوں کا نقش میرے دل پر
بیٹھ جائے گا۔ اور تیرے خبثِ باطن کی تہ کو نہ پہنچ سکوں گا۔ خدا کی
قسم تونے یہ لکیر کھینچکر اسکو طول بلا عرض صرف اس نیت سے بتایا ہی

کہ میرا قدم صراط مستقیم سے ہٹ جائے اور میں اونہ ہے مونہہ دوزخ میں گر پڑوں۔ دانائے آشکار و نہان مجکو ہندسے اور نیز تمہارے تمام خیالات سے خواہ تم اون کا زبان سے اعلان کرتے ہو یا دل میں پوشیدہ رکھتے ہو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ اسپر بھی وہ بے شرم بند نہوا۔ اور پھر بولنا چاہا تو اس خوف سے کہ کہیں پہلے گمراہ کی طرح یہ بھی شرک میں مبتلا نہو مینے لوگوں سے کہا کہ خدا کے لیے اس کے مونہہ پر ہاتھ رکھو یا یہاں سے نکالدو۔ جب وہ مردود بارگاہ لم یزلی شیطان کی طرح مجلس سے نکال دیا گیا تو مینے کاغذ کے ایک پرچہ پر اپنے ہاتھ سے لکھا کہ میں عہد واثق کرتا ہوں اور وہ قسم کہاتا ہوں جسکا کوئی کفارہ نہیں کہ عمر بہر نہ کبھی ہندسہ کی شکل دیکھوں گا نہ علانیہ یا خفیہ۔ اوس کے سیکھنے کا نام لوں گا اور اپنی اولاد کو بھی زور کے ساتھ وصیت کرتا ہوں کہ قیامت تک نہ کبھی اوسکی طرف مونہہ کریں نہ سیکھنے کا خیال کریں۔

اسیطرح صاحب ابن عباد کی نسبت جو موید الدولہ فخر الدولہ دیلمی کا وزیر با تدبیر، خود بے مثل منشی و شاعر، اور تمام اہل کمال خصوصاً اہل سخن کا بے حد قدردان و مربی تہا مشہور ہے کہ ہندسہ سے سخت جلتا تھا اور اہل ہندسہ پر گاہ و بے گاہ تبرا کیا کرتا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ اس گروہ بے عقل میں سے ایک بے شعور نے یہ حرکت کی کہ مجھکو ہندسہ کا شوق دلانے کے لیئے چھپیس ۲۵ کے عدد کو ثابت کرتے اور کچھ لکیریں اور شکلیں کاڑھ کر اپنے زعم باطل میں اوسپر دلیلیں قایم کرنے لگا۔ مینے کہا حضرت جس چیز کو آپ اسقدر زحمت گوارا کرکے ثابت کرنا چاہتے ہیں اوس سے تو میں بغیر دماغ کو تکلیف دیئے یونہیں بخوبی واقف تھا۔ آپنے یہ کیڑے مکوڑے

کاڑھنے کی تکلیف ناحق اوٹھائی۔ آپ کا ہندسہ بھی واللہ عجیب چیز ہے کہ عمر بھر کی جانی پہچانی چیزوں کو گورکھ دھندا بنا دیتا ہے۔ یہ علم کاہے کو ہوا جان کا جنجال سمجھہ کا وبال ہوا۔ کس کی شامت آئی ہے کہ بیٹھے بٹھلائے مفت خدا درد سر مول لے ٭

ناظرین سے اُمید ہے کہ اِس مضمون کو پڑھتے وقت ابن ثوابہ کے زمانہ کے لوگوں کے مذاق اور خاصکر اون کے مذہبی جوش کا لحاظ رکھیں گے۔ کیونکہ بغیر اس کے چنداں لطف نہ آئے گا۔ اور لطیفوں کی باریکیوں پر شاید نظر نہ پہنچے گی ٭

فدا علیخاں رامپوری

غزل

مری ناکامیٔ جاوید تیرا مدعا کیوں ہو
تری امید کا آزار دردِ لادوا کیوں ہو

وہ دل جس سے ابھی دونوں جہاں کے کام لینے ہیں
تری موہوم سی امید پہ صرفِ فنا کیوں ہو

مری تقدیر بھی تیری طرح کیوں مجھسے پھر جائے
بھلا بیفائدہ ہر ساز تیرا ہم نوا کیوں ہو

کسی کلفت زدہ کا دل دُکھا کر کیا بھلا ہوگا
تری پاکیزہ عادت کا یہی اک مقتضا کیوں ہو

مجھے یہ ضد کہ "تجھسے خستگی کی داد چاہوں گا"
تجھے یہ ہٹ کہ "اک برگشتہ قسمت کا بھلا کیوں ہو"

تجھے مجھپر خدا ناخواستہ کیوں رحم آ جاتا
ترے دل میں نصیبِ دشمناں خوفِ خدا کیوں ہو

مری تقدیر ہی میری ڈبو دینے کو کافی ہے
میری ٹوٹی سی کشتی کیلئے طوفاں بپا کیوں ہو

مرے کلفت زدہ دلکو بہانہ ہاتھہ آتا ہے
مرے آگے گذشتہ صحبتوں کا تذکرہ کیوں ہو

ترا آزاد پابندِ علایق ہو نہیں سکتا
وہ آزادی کا عاشق ہے گرفتارِ بلا کیوں ہو

(آزاد سہارنپوری)

سفرنامہ سویڈن و روس

صبح کا سہانا وقت تھا اور فرحت بخش ہوا خلیج مالیر کی سطح پر چل رہی تھی موسم ایسا خوشگوار اور دلفریب تھا کہ اس سے روح کو مسرت حاصل ہوتی تھی۔ ۶ بجتے ہی ہمارا جہاز بندرگاہ سے روانہ ہوا۔ کیونکہ روانگی کے لیے یہی وقت مقرر کیا گیا تھا۔

سٹاکہوم کا خوبصورت شہر اپنے سفید سفید مکانات اور اپنے خوش وضع شاہی محل کے اعتبار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک حسین و شکیل دوشیزہ سطح آب پر شاداں و خنداں کھڑی ہوئی ہے۔ ہمیں اس شہر کی جدائی کا سخت افسوس تھا کیونکہ ہم نے یہاں کے نیکدل باشندوں میں رہکر بہت لطف اٹھائے اور یہاں کے ان تمام جلسوں میں جو ولیعہد کی شادی کی تقریب میں منعقد ہوئے شریک تھے اور وفاشعار رعایا نے جن جن طریقوں سے اپنے نیک بخت بادشاہ اور ہر دلعزیز ولیعہد کے ساتھ وفاداری کے ثبوت دیئے تھے انہیں ہم نے بچشم خود دیکھا تھا۔ ہمارے راستے کے بائیں جانب ہرنوں کی شکارگاہ تھی جسکا نظارہ بڑے بڑے درختوں اور خوبصورت مکانات کے سبب سے بہت دلفریب تھا۔ یہہ بیکار اور شایقینِ تفریح لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ ہے۔ داہنی طرف بنجر چٹانیں تھیں جن سے وحشت برستی تھی۔ البتہ اپر کہیں کہیں صنوبر کے سیاہی مایل درخت اُگے ہوئے تھے۔ لیکن چونکہ پتھروں کی وجہ سے اُن کی نشو و نما کے سامان مفقود تھے۔ اس وجہ سے یہہ درخت سرسبز اور

بلند نہ تھے۔ جہاز کے راستہ میں کئی میل تک طرح طرح کے منظر ہمارے پیش نظر رہے۔ اُن کی ظاہری حالت گو تغیر پذیر تھی۔ مگر اُن کی خوبصورتی مستقل تھی۔ آخر کار ہم ویگزہوم پہونچے۔ یہ جزیرہ فوجی طاقت کے لحاظ سے بہت مضبوط ہے اور مملکت سویڈن کا پہلا جنگی مقام ہے۔ روس کے راستہ میں بنایا گیا ہے۔ یہاں کی توپوں کی ٹھیک زد پر زار روس کا ایک جنگی جہاز کھڑا ہوا تھا۔ اس مقام سے اُس نہر کی حفاظت کی جاتی ہے جسمیں بڑے بڑے جہاز بھی چل سکتے ہیں اور یہ مقام قدرتی طور پر بھی بہت مضبوط واقع ہوا ہے۔

سویبرگ ہاتھ سے گیا۔ یہی حال آلینڈ کا ہوا۔ ویگزہوم پر بھی جو ابھی تک سویڈن کا جایز مقبوضہ سمجھا جاتا ہے اُس کے دانت ہیں۔ لیکن اسوقت تک یہ سنتری (ویگزہوم سے مراد ہے) آزادی کے پھاٹک پر پہرا دے رہا ہے اور اُسکو ظالمانہ دست درازی سے بچانے پر آمادہ ہے اور اسبارہ میں وہ دوست دشمن دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کرتا ہے۔

بحر بالٹک میں داخل ہونے کے بعد ہمکو بشیار چھوٹے چھوٹے جزیروں میں سے ہوکر گذرنا پڑا اُن میں سے بعض ایسے تھے کہ اُن کا تھوڑا ہی سا حصہ سطح سمندر سے اونچا تھا۔ البتہ بعض بعض میں اونچے اونچے پہاڑ کے ٹیکرے بھی نظر آئے اور ماہی گیروں کی کشتیاں بھی بکثرت دکھائی دیں جو کبھی نگاہ میں رہتیں اور کبھی غائب ہوجاتیں۔ یہ بات بھی غنیمت تھی کہ اِن دلچسپ مناظر کی وجہ سے ہماری طبیعت بہل گئی ورنہ ہمارا خراب خستہ مختصر جہاز اسقدر سست چلتا تھا کہ مجمع الجزائر آلینڈ تک پہونچتے پہونچتے آدھی رات ہوگئی۔

اس جگہ ہمیں ٹھہرنا پڑا کیونکہ یہاں سے جہاز کو لکڑیاں لینی تھیں۔

یہ جزایر جو ۱۸۰۹ء میں روس کو تفویض کیئے گئے تھے ضلع آبو کا ایک حصہ ہیں۔ یہ خلیج بوتھینا میں واقع ہیں اور یہ ایک ایسا موقع ہے کہ جسکی وجہ سے مملکت سویڈن پر پورا دباؤ پڑ سکتا ہے اور سویڈن اور روس کے مابین جنگ چھڑ جانے کے وقت یہاں جنگی جہازات کے بیڑے رکھے جا سکتے ہیں جو اول الذکر کے حق میں بہر طور ایک خطرناک اثابت ہوگا۔

صبح کے چھ بجے سے پہلے ہمارا جہاز روانہ نہو سکا۔ سو وقت تک عجب کشمکش جہاز پر رہی۔ ایک درجن سے زیادہ آدمی تختۂ جہاز پر جمع تھے اور ہر ایک شخص لکڑی کے سڈول تختہ کی تلاش میں تھا۔ جس پر لیٹ کر رات بسر کرے۔ جہاز پر لکڑیوں کے انبار اسقدر اونچے اونچے تھے کہ ہوا اُن سے ٹکرا کر جہاز کو ڈگمگا دیتی تھی اور بعض اوقات تو جہاز کے بالکل تہ وبالا ہو جانے کا خیال ہوتا تھا۔ اب ہمارا جہاز رود آؤرا میں داخل ہوا۔ اسی ندی پر فنلینڈ کا قدیم دارالسلطنت آبو واقع ہے۔

ہمارے بائیں جانب پرانے محل کے مینار نظر آتے تھے جو اپنی قد و قامت کے لحاظ سے اگرچہ قابل عزت ضرور تھے لیکن اُن کی ظاہری حالت کچھ اچھی نہ تھی۔ تاہم اس محل میں ایک خاص قسم کی دلچسپی تھی جسکو اس کی صنعتی خوبیوں سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بجائے خود زمانۂ قدیم کی ایک مقدس یادگار ہے اور علاوہ ازیں تاریخ اسکا تعلق بہت سے دلچسپ واقعات سے ہے۔ یہاں ایرک نے جو گستاوس وازا کا ایک ناخلف فرزند تھا اپنے بھائی کو قید کیا اور ہر قسم کے ظالمانہ

کام کرنے کے بعد خود بھی یہیں مقید ہوا۔ زمانۂ قدیم میں اسکو فنلینڈ کا قلعہ خیال کرتے تہے کئی دفعہ یہہ روسی حملہ کے لیئے سد راہ بنا اور بعض اوقات اِس کے ذریعے سے اُن سیاسی جماعتوں کا مقابلہ کیا گیا جو تیرہویں اور سولھویں صدی کے مابین حکومت کے لیئے جنگ و جدال کرتی تہیں۔

آؤرا ایک غیر معروف ندی ہے اُس کے دہانہ سے دو میل کے فاصلہ پر شہر آبو واقع ہے جس ہی کہ ہم بندرگاہ میں داخل ہوئے محکمۂ چنگی کے چند افسر جو صورت سے نہایت سیدھے سادے معلوم ہوتے تھے جہاز پر آئے۔ ہم نے پروانہ راہداری جو کپتان سے پہلے ہی لے لیئے تھے اُن کو دیئے جس سلسلے سے ہمارے نام فہرست میں درج تہے اُسی کے مطابق نمبر وار معائنہ کیا گیا۔ اور اسباب کی نہایت سخت دیکھ بھال کے بعد ہمکو خشکی پر آنے کی اجازت ملی +

دریافت کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ سینٹ پٹرز برگ کو جو سٹیمر جانے والا تھا وہ صبحکو روانہ ہوچکا اور جس جہاز پر کہ ہم آئے تہے وہ ایک ہوٹل والے کا تھا جس نے اپنے فایدے کے لیے نہایت ہوشیاری سے یہہ انتظام کر رکھا تھا کہ موخر الذکر جہاز اول الذکر کی روانگی کے بعد آبو پہونچا کرے اور اِس طرح اُسے ہر ہفتہ ایک کثیر تعداد مسافروں کی رُوک لینے کا موقع ملتا جو کئی دن تک اُس کے "سوسائٹی ہوٹس ہوٹل" میں ٹہیرا کرتے۔ اِس تعویق میں ہمارے لیئے صرف یہی امر اطمینان بخش تھا کہ ہوٹل کا انتظام عمدہ اور باقاعدہ تھا۔

دوسرے دن ہمکو صاحب ضلع کے پاس جانا پڑا۔ اور اوس نے ہمیں سینٹ پٹرز برگ تک کا پروانۂ راہداری دیا۔ لیکن اسپر ابھی

پولیس کی تصدیق ضروری تھی جس کے بغیر یہ کسی کام کا نہ تھا۔ اس کے لیئے ہمیں کچھ فیس بھی دینی پڑی۔

آبو فنلینڈ کا قدیم ترین شہر ہے اور اس ملک میں مذہب عیسوی کا یہی گہوارا تھا۔ لیکن اُس کے زمانۂ ترقی و عروج کی یادگاریں اب بہت کم ہیں۔ یہ بہت سی مصیبتوں کا آماجگاہ بنا رہا۔ اِن سب پر طرہ وہ آتشزدگی تھی جو ۱۸۲۷ء میں وقوع پذیر ہوئی۔ ہلسنگفورس دارالحکومت بنا یا گیا ہے اور سلطنت روس نے اپنی حکمت عملی سے یونیورسٹی کو بھی وہیں اٹھوا دیا ہے تاکہ لوگوں کو جو رہا سہا تعلق اپنے مذہب کے مولد اور اپنے دارالعلم سے تھا باقی نہ رہ جائے۔ اور جو امداد اس شہر کو ملتی تھیں وہ سب موقوف کر دی گئیں اور آخر نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کی تجارت کو جو اب کچھ دنوں سے بہرہ وہ ترقی ہے نقصان پہنچنے لگا اور تھوڑے ہی دنوں میں وہ تقریباً بالکل مٹ گئی۔

یہاں کا قدیم گرجا اسی آتشزدگی کی نذر ہوا جس کی وجہ سے اسکا اندرونی حصہ تمام جل گیا اور بہت سی یادگاریں جو اس کے اندر بنی ہوئی تھیں برباد ہوگئیں۔ یہ گرجا جو شاہان گاتھ کے عہد کی ایک قدیم عمارت ہے اب بھی موجود ہے اور اسکی مرمت بھی کسیقدر ہوگئی ہے۔ اسیکے قریب خوشوضع گریک چرچ کھڑا ہوا پرانے گرجا کو جو بجائے خود بہت باعظمت ہے منہ چڑھا رہا ہے گویا کہ ایک تنک ظرف لڑکی کسی مہذب اور با مذاق بوڑھی عورت کو جو اس سے زیادہ شریف اور شوقین ہے اپنا حُسن وجمال دکھارہی ہے۔

ہم اس گرجا میں داخل ہوئے اور چاروں طرف کی چیزوں کو

اور اُن لوگوں کی یادگاریں کو جن کی قسمت میں جلد مٹ جانا اور صفحۂ ہستی سے محو ہو جانا بدا تھا بڑی دلچسپی سے دیکھنے لگے منجملہ اُن کے ہم نے ایک سنگی لوح دیکھی جو کیتھرائن مارس کی یادگار میں وہاں نصب تھی کیتھرائن ایک کاشتکار کی لڑکی تھی اُس کا حُسنِ صورت بہت دلکش و دلفریب تھا ایرک چہاردہم اُسے زبردستی اُس کے مکان سے نکال لے گیا اور اپنے ساتھ اُسکو غیر معمولی شان و شوکت سے تخت نشین کیا۔ لیکن ظالم شوہر کے زوال کے بعد وہ بالکل مفلس رہگئی اور نہایت ہی قابل رحم حالت میں اُسکا انتقال ہو گیا۔

نیچے کے تہ خانوں میں فنلینڈ کے شریف اور فرزانہ لوگوں کی نعشیں دفن تھیں جو یکساں ابتری کی حالت میں صندوق سے نکلی ہوئی ادھر اُدھر پڑی تھیں۔ مشہور لوگوں کی لاشیں البتہ نمایاں طور پر رکھی ہوئی تھیں تاکہ اجنبی لوگ بآسانی دیکھ سکیں۔ منجملہ اُن کے ایک لاش کسی فلاسفر کی تھی۔ کاسہ سر کی جسامت اور وضع سے اُس شخص کی عالی دماغی۔ اور غیر معمولی ذہنی قابلیت ظاہر ہوتی تھی۔

ہمارے راہبر نے تمسخر اور شوخی کے ساتھ ہم سے کہا کہ ذرا نیچے اُتر کر دیکھئے کہ پروفیسر صاحب کس شان سے دکھائی دیتے ہیں" آہ! یہ اُس شخص کی ہڈیاں پڑی تھیں جسکا اکثر غالباً اُس کی زندگی میں گرد و پیش ساری عمر رہا ہوگا اور جسکو بزمانۂ حیات اپنے ہموطنوں میں ہر دلعزیزی حاصل ہوگی اور جنکی موت پر سبھوں نے اشک تاسف بہائے ہونگے۔ لیکن اب اُسی کے ساتھ خوش طبعی کیجاتی ہے اور وہ گنوار وں کی تشنیع و طعن کا ہدف بن رہا ہے۔

سید محمد فاروق

"گلزار نسیم"

اور

نظم قصۂ گل بکاولی فارسی زبان میں

رسالۂ "مخزن" کے ناظرین نے اوس کے پچھلے صفحوں میں "ریحان حسین خان متخلص بہ ریحان" لکھنوی کی مثنوی کے اشعار ملاحظہ فرمائے ہونگے جسکا تاریخی نام "باغ و بہار" ہے۔ وہ ۱۲۱۷ھ میں کہی گئی تھی۔ اوس کا رنگِ سخن وہی ہے جو "گلزار نسیم" کا ہے اور بحر بھی وہی ہے۔

"مخزن" میں اگرچہ جرح اور تعدیل نہیں کی گئی لیکن دونوں مثنویوں کے ہم رنگ اور ہم مطلب اشعار برابر برابر لکھ دیے گئے ہیں تاکہ نگاہیں خود موازنہ کرلیں۔

"گلزار نسیم" کا تاریخی مصرع "توقیع قبول روزِ لشیں باد" خود اوس کے مصنف کا طبع زاد ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ ۱۲۵۴ھ میں کہی گئی تھی گویا "باغ و بہار" "گلزار نسیم" سے ۳۷ برس پیشتر تصنیف ہوئی تھی۔

دونوں کو دیکھکر یہ اندازہ کیا گیا کہ "گلزار نسیم" میں اختصار اور فصاحت زیادہ ہے۔ ۳۷ برس قبل اور بعد کی زبانوں میں فرق ہونا ہی چاہیے تھا خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ناسخ مرحوم زبان کی اصلاح پر ہر پہلو سے متوجہ ہو گئے تھے۔

یہ وجہ بھی قابل تسلیم ہے کہ نقش اول کے بعد نقش ثانی میں کچھ نہ کچھ

خوبیاں بڑھ ہی جاتی ہیں اگر "نسیم" نے بہ نسبت "ریحان" کے خوبیاں بڑھادیں تو لطف سخن سنجی ایسی ترقی کا مقتضی بھی تھا۔

مجھے اسوقت جو کچھ لکھنا ہے یہ "باغ و بہار" سے علحدہ ایک اور ہی بات ہے اور جس کے سبب سے یہ فیصلہ مشکل ہوگیا ہے کہ آیا "گلزار نسیم" نقش ثانی ہے یا نقش ثالث۔

میرے سامنے فارسی زبان میں نظم قصہ گل بکاولی کا رکھا ہوا ہے۔ اسکی بحر بھی وہی ہے جو "باغ و بہار" اور "گلزار نسیم" کی ہے۔ اور رنگ سخن بھی ملتا جلتا ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے بہت اوراق اول کے اور بہت آخر کے غائب ہیں۔ پتا نہیں ملتا کہ یہ کس سنہ میں تصنیف کی گئی تھی۔ اس کے مصنف "رفعت لکھنوی" ہیں جنکو میں نہیں جانتا۔ تخلص اس نظم میں بہ کثرت موجود ہے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ پہلے یہ فارسی کی مثنوی تصنیف کی گئی تھی یا گلزار نسیم البتہ فارسی کی مثنوی میں دو شعر ایسے ہیں جن سے یقین تو نہیں لیکن گمان ہوسکتا ہے کہ "گلزار نسیم" سے پیشتر کہی گئی ہو تو کچھ تعجب نہیں۔

وہ اشعار یہ ہیں۔

یعنی چو کہن نشد زمانہ　　　کم قدر شدہ است ایں فسانہ

خواہم کہ بگویمش دگر بار　　　یارب بکشا لبم بہ گفتار

"دگر بار" کے الفاظ سے یہ مطلب نکالنا قرین قیاس ہوسکتا ہے کہ "گلزار نسیم" اوسوقت تصنیف اور شہرت کے دائرے میں نہیں آئی تھی۔ "کم قدر" کے الفاظ کا اطلاق بھی "گلزار نسیم" پر نہیں ہوسکتا جسکی قدر اور جس کے سبب سے قصے کی قدر تصنیف کے زمانے سے آجتک

ایک سی حالت میں ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ "رفعت" نے کم قدر ہونے کا حرف گل بکاولی کے پرانے قصے پر رکھا ہے۔ اسکو تسلیم کرلو تو پھر یہ تسلیم کرلینا پڑے گا کہ "گلزار نسیم" اوس وقت موجود نہیں تھی اور یہ کہ "رفعت" کی فارسی مثنوی "گلزار نسیم" سے مقدم ہے۔

ہم کو بغیر کسی قطعی دلیل کے صرف قیاس کی بنا پر یہ کہنا کہ "رفعت ہی مقدم تھے اور "نسیم" ضرور موخر ہیں۔ زیبا نہیں ہے۔ لیکن ہمارے فہم کو اس بات کے سمجھنے میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ ایک مثنوی کی تصنیف کے وقت دوسری زیر نگاہ یا پیش دماغ ضرور تھی۔ اس لیے کہ بعض اشعار۔ اور اکثر مصرعے دونوں مثنویوں میں اس قدر ہم رنگ یا ہم الفاظ ہیں جنکو دیکھکر بےساختہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ دونوں سخن سنجوں میں سے ایک مصنف اور دوسرا مترجم ہے۔ اکثر مثالیں بھی ایسی ہیں جو زبان کا بھیس بدلے ہوئے دونوں مثنویوں میں موجود ہیں لیکن شکل ایک ہی ہے۔

جو فرق طوالت اور اختصار کا "باغ و بہار" اور "گلزار نسیم" میں ہے۔ وہی اس فارسی کی مثنوی اور گلزار نسیم میں بھی ہے۔ یہ صورت بھی کچھ پتا دیتی ہے کہ عجب نہیں۔ گلزار نسیم ہی موخر ہو۔ اسلیے کہ "باغ و بہار" اور "رفعت" کی مثنوی دونوں کے پہولوں کا کھنچا ہوا جوہر "گلزار نسیم" کے رنگ میں پایا جاتا ہے +

اب ہم "رفعت" اور "نسیم" کے رنگوں کی یکرنگی مختصراً دکھاتے ہیں تاکہ ارباب نظر خود فیصلہ فرمالیں کہ ایک نظم کو دوسری نظم سے کہاں تک تعلق ہے +

رفعت — باعیسے چشم یک نظر بود

نسیم۔ عیسے کی تئیں اوس نے آنکھیں دیکھیں

شاید فارسی مصرع میں کاتب کی قلم سے کسی لفظ کا تغیر و تبدل ہو گیا ہے اسلیئے کہ ترکیب اسکی صاف معنی نہیں پیدا کرتی ۔ مگر یہ مطلب بہرصورت حاصل ہے کہ فارسی اور اُردو کی دونوں نظموں میں دونوں مصرعوں کا ماخذ ایک ہی دماغ ہے ۔

رفعت ۔ چوں مردمکش نگاہ دارید۔

نسیم ۔ پتلی سا نگاہ رکھہ کے پالا۔

رفعت ۔ عازم بہ سفر شدند ہر چار
زیشاں بہ بریدشاہ ناچار

نسیم ۔ شہزادے ہوئے وہ چاروں تیار
رخصت کیئے شاہ نے چار ناچار

رفعت ۔ گفتند کہ چشم شاہ شد کور
تا چید زعارض پسر نور

نسیم ۔ سلطان زین الملوک شہ زور
دیدار پسر سے ہو گیا کور

رفعت — بارے چو بخشش ترا نماید
بینائی چشم تو ربا ید

نسیم — پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ ایکبار
پھر دیکھ نہ سکیگا کسیکو

رفعت — مے گشت چو گرد رہ بدشتے

نسیم — میدان میں خاک اڑا رہا تھا

رفعت — درمشت تو باد را بپیما

نسیم — مٹھی میں ہوا کا تھامنا کیا

رفعت — در دیدہ کنم چو مردمک جا

نسیم — ہے چشم پری میں جائے مردم

رفعت — چوں سرو بہ ہر طرف خراماں

نسیم — شمشاد رواں ہوا چمن میں

رفعت۔ از بر تو اے بتِ پری رُخ
مشہور شدم بنام فرخ

نسیم۔ فرخ ترے واسطے ہوئی میں

رفعت۔ حالت بہ زبان تو شنیدم

نسیم۔ سب تجھ سے سنی تری زبانی

رفعت۔ ہیہات کہ رو نہفتی از من

نسیم۔ تو نے کیوں آکے منہ چھپایا

رفعت۔ اے دلبر دلبر زیاں کار

نسیم۔ اے دلبر دلبر دغل باز

رفعت۔ اے شاہِ ارم بتِ گل اندام
فرخ لقب و بکاولی نام

نسیم۔ اے شاہِ ارم کی بنت گلفام

فرخ لقب و بکاولی نام

رفعت۔ باز آمدہ آب رفتہ در جو

نسیم۔ آیا پھر آب رفتہ جو میں

رفعت۔ ہمچوں در توبہ در کشادہ

نسیم۔ توبہ کا سا در کھلا ہوا تھا

رفعت۔ در جامۂ خویشتن نہ گنجید

نسیم۔ پھولا نہ وہ جامے میں سمایا

مینے یونہی اوراق کو الٹ پلٹ کے سرسری نگاہ سے انتخاب کر دیا جو دونوں نظموں کا موازنہ کرنے کے لیئے غالباً کافی ہو۔ اگر کوئی غور اور تامل کے ساتھ دیکھے تو کثرت سے اِن دونوں مثنویوں کے اشعار باہم دست و بغل ملیں گے۔

اب میں رفعت کی مسلسل نظم مختصر طور پر دکھاتا ہوں کہ رنگ کلام کے اتحاد کا اور بھی عقدہ کھل جائے۔

بکاولی کا خط تاج الملوک کے نام

اے یار جفا شعار عیار　　اے دلبر دلبر زیاں کار

اے دشت نوردِ درد و محنت　　اے رہروِ منزلِ محبت

اے نقب زنے بہ کوئے جانہا　　اے حاملِ آرزوئے جانہا

اے داغ نہِ سرینِ حاسد　　اے مہر نما بہ کینِ حاسد

اے یوسفِ مصرِ حسن و اقبال　　اے رشکِ برادرانِ بدفال

اے دیو سوار و مونسِ دیو　　اے پرفن و حیلہ ساز و پرریو

اے نقدِ دل دو کون در کف　　چوں دزد حنا چراغ برکف

بردی بہ فریب گل ز باغم　　کردی ہمہ تن چو لالہ داغم

بودم ز مے شبیں سحر مست　　انگشترِ من بہ بردی از دست

دیدی بدنِ نہفتہ عریاں　　در چشم تو بس شدم پشیماں

از بہر تو اے بتِ پری رخ　　مشہور شدم بہ نام فرخ

در خلوتِ خاص تو رسیدم　　حالت بہ زبانِ تو شنیدم

چون دامنِ گل تنت کنم چاک　　چوں باد بہ تہمت افگنم خاک

زود آسے و بہ پہلوم بیاسائی　　سے سائے سر نیاز بر پائے

تاج الملوک کا خط بکاولی کے نام۔

اے شاہِ ارم بتِ گل اندام　　فرخ لقب و بکاولی نام

اے راہ نوردِ بے وفائی　　اے گم کنِ راہِ آشنائی

زلفِ تو نمے رود گہے از یاد　　زنجیر بہ پائے جانم افتاد

ہیہات کہ رو نہفتی از من　　رازِ دل خود نہ گفتی از من

اکنوں طلبی مرا سوئے خویش　　پاشی چہ نمک تو بر دلِ ریش

آن ہمت عالیم کنون نیست ۔۔۔ این شوق مرا بجز جنون نیست

حالہ مرا چو شد مددگار ۔۔۔ از یاری او برآمد این کار

گر سے طلبی مرا در آن جا ۔۔۔ بفرست بہ رہبری کسے را

تاج الملوک اور بکاولی کی گفتگو

پس گفت چگونہ گل ربودی ۔۔۔ گفتا کہ چو خوش بہ خواب بودی

گفتا گل من فسردہ چوں شد ۔۔۔ گفتا دل من چگونہ خوں شد

گفتا کہ چہ بہ ناز مغرور ۔۔۔ گفتا کہ ترا چہ ہست منظور

جمیلہ کا تاج الملوک اور بکاولی کو ایک جگہ دیکھنا

در باغ گل دگر شگفتہ ۔۔۔ دختر بہ کنار غیر خفتہ

بر گنج نہاں نشستہ مارے ۔۔۔ در دامن گل خلیدہ خارے

زد بانگ برادر جمیلہ کیں چیست ۔۔۔ این فتنۂ خفتہ دلبر کیست

این کیست کہ در برت خفت است ۔۔۔ اے طاق بخفتہ این چہ جفت است

ایک بات اور بھی میرے خیال میں آئی جس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ "رفعت" کی نظم مقدم ہے۔ یعنے اِس فارسی کی مثنوی میں اصل قصے کو بھی بہ نسبت "گلزار نسیم" کے طوالت ہے۔ نسیم نے شاید خذ ما صفا ودع ما کدر پر عمل کیا۔ طویل کو انتخاب سے مختصر کر دینا یہ ایک قیاسی دلیل اس امر کی ہو سکتی ہے کہ "گلزار نسیم" موخر اور منتخب سمجھی جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا اس لیے کہ "نسیم" نے ہر مطول کو مختصر کیا ہے

احمد علی شوق۔ قدوائی۔

میل جول

انسان کے آپسمیں میل جول پر ایک کتاب مختلف پہلوؤں سے لکھی جاسکتی ہے۔ منجملہ اِن پہلوؤں کے ایک پہلو سائنٹفک پہلو بھی ہوسکتا ہے جسمیں یہ خصوصیت ہے کہ ان قدرتی قوانین کی زیادہ توضیح ممکن ہے۔ جنکی پابندی انسانی میل جول میں ہونی چاہیئے اگر ہمیں بخیتہ طور پر معلوم ہوتا کہ وہ قوانین کیا ہیں تو ہم بآسانی اِس امر کی پیشین گوئی کرسکتے کہ اِس مزاج کے آدمی آپسمیں راہ و رسم خوشی سے رکھیں گے اور اِس طبیعت کے ایک دوسرے سے علیحدہ رکھیں گے۔ اِس صورت میں انسانی میل جول ایسا ہی یقینی سائنس ہوتا جیسا کیمسٹری جسمیں ہم نہایت وثوق اور درستی کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ اِن اشیاء کو یکجا کرنے سے یہ نتیجہ پیدا ہوگا۔ بعض حالتوں میں اِس سائنٹفک حد کے قریب قریب پہنچنا ممکن بھی ہے۔ مثلاً جب ہم دو آدمیوں کی خصوصیت سے بخوبی واقف ہوں تو ہم کسی حد تک درستی کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ اون کی آپسمیں نہ نبھیگی +

بعض دوربین اشخاص افراد کے باہمی میل جول کے متعلق بہت صحت کے ساتھ رائے زنی کرسکتے ہیں۔ مگر بس یہیں انکی دانائی کا خاتمہ ہوجاتا ہے وہ اِن مختلف مثالوں سے کوئی عام قاعدہ یا قانون نہیں بنا سکتے جن پر دیگر قوانین قدرت کی طرح عملدرآمد کیا جاسکے۔ اِس لیئے اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اِس قسم کے

قانون قوانین قدرت میں سے نہیں بلکہ ان کی ایک ناقابل اعتبار اور بھدی نقل ہیں +

اس مشکل کے پیش آنے کی وجہ یہ ہے کہ انسانی طبائع بے حد مختلف واقع ہوئی ہیں اور اسی اختلاف کا باعث ہے کہ جس آدمی کو ہم پہلے سے نہیں جانتے اور جسکی عادات و اطوار کے مطالعہ کا ہمیں موقع نہیں ملا تو اسکی نسبت ہم اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے ڈرتے ہیں اسلیئے ان لوگوں کی نسبت جن کے حالات سے ہمیں کچھ بھی واقفیت نہیں ہم کس قدر غلط رائے قائم کر سکتے ہیں اور یہ دریافت کرنا ہمارے لیے کس قدر مشکل ہے کہ وہ کس قسم کے آدمیوں کو اپنا دوست بنائیں گے

انسانی میل جول کے متعلق بعض خیالات جو عوام میں مشہور ہیں خالی از دلچسپی نہیں مثلاً عام طور پر مانا جاتا ہے کہ بے تکلف دوست ہونے کے لیئے دونوں کو ایک ہی فرقے اور قریب قریب ایک ہی حیثیت کا ہونا چاہیئے۔ مگر جب ہم واقعات پر نظر ڈالتے ہیں تو بہت سی مثالیں اس کے بالکل برعکس نظر آتی ہیں۔ ایک اور خیال یہ ہے کہ آپس میں میل جول بڑھانے کی وجہ ایک خاص بات میں دونو اشخاص کا دلچسپی لینا ہوا کرتی ہے۔ میرے خیال میں بہت سی مثالیں ایسی دیکھنے میں آتی ہیں کہ ایک ہی بات میں دلچسپی لینا دوستی کا باعث ہونے کے بجائے موجب فساد ہوا ہے۔ البتہ اسوقت تک نبھتی رہتی ہے جب تک طرفین میں سے ایک کسی قدر لاپرواہی برتے۔ جتنی زیادہ دلچسپی ایک بات میں ہو گی اسی نسبت سے اس کے متعلق فروعی چیزیں بھی ہماری

نظر میں ضروریات سے بڑھکر ہونگی مثلاً دو شخص مذہب کے سبب سے دلدادہ ہیں مگر انمیں سے ایک مسلمان ہے اور دوسرا عیسائی تو اس حالت میں انکا باہمی میل جول باوجود ایک ہی بات میں دلچسپی لینے کے ناممکن ہے۔ حالانکہ اگر وہ مذہب کے معاملہ میں لاپروا ہوتے تو انکا میل جول دوستی کی حد تک پہنچ سکتا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قومیت کا فرق باہمی میل جول کی راہ میں ایک بھاری رکاوٹ ثابت ہوتا ہے۔ مگر نہیں واقعات اس کی تردید کرتے ہیں اسمیں شک نہیں کہ قدرتی طور پر ایک قسم کا تعصب ہمارے دلمیں غیر قوم کے لوگوں کے لیے ہوتا ہے اور ہمارا یہہ خیال ہوتا ہے کہ ہماری ایک اجنبی شخص کے ساتھ نہیں بن سکتی۔ مگر جب یہ غلط خیال رفع ہو جائے تو اجنبیت وغیرہ سب جاتی رہتی ہے اور اتحاد قایم ہو جاتا ہے۔ البتہ زبان کا اختلاف ضرور سدراہ ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا سطور سے صاف ظاہر ہے کہ باہمی میل جول کے لیے کوئی کلیہ قاعدہ قرار دینا کسقدر مشکل ہے۔ نہ ہم فرقہ ہی ہونا آدمیوں کو ایک دوسرے کی طرف راغب کرتا ہے نہ ایک نسل کا ہی ہونا اور نہ کسی ایک خاص بات میں دونوں کا دلچسپی ہی رکھنا البتہ اگر کوئی کلیہ قاعدہ بنایا جا سکتا ہے تو میری رائے میں اس سے بہتر اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ دو آدمیوں کی شخصی خصوصیات میں یگانگت اِن کے زیادہ ربط وضبط کا باعث ہوتی ہے یہ شخصی یا ذاتی خصوصیت کیا چیز ہے میں نہیں جانتا اور نہ مجھے کسی ایسے دانا آدمی سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جس نے اِس کے متعلق

سے مجھے آگاہ کیا ہو۔ یہ شخصی خصوصیت ایک معمہ ہے اور اس کی پیچیدگی ہم پر بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ جب ہم اپنے دوستوں میں سے ایک خاص دوست کی طرف زیادہ مائل ہونے کی وجہ دریافت کرنا چاہتے ہیں اور نہیں کر سکتے +

مینے کئی دفعہ اس بات کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اپنے دوستوں میں سے ایک خاص دوست کی صحبت میں زیادہ لطف کیوں آتا ہے۔ بظاہر اس میں کوئی خاص بات ایسی نہیں پائی جاتی جو اسے اوروں سے ممتاز کر دے۔ میری اسکی عادات بھی کچھ متی جلتی نہیں۔ اس کے عیب بھی مجھسے پوشیدہ نہیں۔ پھر ہے تو کیا وجہ ہے معلوم ہوا کہ اوروں میں وہ خاص بات نہیں جو میل جول کو دلچسپ بنائے یہ خاص بات کیا ہے میں نہیں بتا سکتا +

مذاق کی موافقت ایک ایسا فقرہ ہے جو میرا مطلب کسی حد تک ظاہر کرتا ہے۔ مگر اسپر وضاحت سے لکھنا اس لیئے مشکل ہے کہ انسانی طبائع کے اختلاف کا آجتک کسی کو پتہ نہیں چلا

مذاق کی یگانگت یا ناموافقت دو ایسی طاقتیں ہیں جو باہمی میل جول کو ممکن یا ناممکن بتاتی ہیں مگر ان کی وجوہ ایسی پیچیدہ پہیلیاں ہیں کہ جنہیں بوجھنے کے لیئے بڑے بڑے بوجھ بجھکڑ سر دھنتے ہیں۔ فقط

محمد عبد الرحمن۔ بی۔ اے۔

گذشتہ اشاعت سے آگے

ڈاکٹر جان کیرڈ سابق پرنسپل و وائیس چانسلر گلاسگو یونیورسٹی مذہب کی توضیح جس میں انہوں نے مذکورہ صدر خیالات کو ظاہر کیا ہے اِس طرح کرتے ہیں۔ مذہب یہ ہے۔ کہ محدود ارادت بحیثیت غیر محدود کے تابع کیا جائے۔ ہر خواہش۔ ہر تمنا اور ہر آرزو کو جو بہ حیثیت انسان مجھ میں پائی جاتی ہے۔ اِس سے انحراف کروں اور ہر مقصد اور غرض سے جو خاص میری خوشی اور فائدہ سے متعلق ہے۔ اجتناب کروں یعنے میں اپنی مرضی کو بالکل خدا کی ارادت کے تابع کر دوں اور اپنے تئیں اُس پر چھوڑ دوں[1]" اگر مذہب کی غائت اپنی شخصی مرضی کو خدا کی مرضی سے بالکل تابع کرنا ہے تو احتیاج یہی ہے کہ ہم اپنی خوشی سے اپنی مرضی کو خدا کی ارادت کے سپرد کر دیں۔ کیونکہ اِس سے انسانی اور الٰہی مرضیوں کے درمیان ایک قسم کی قرابت اور وصل واقع ہو جاتا ہے محدود اپنے تئیں غیر محدود[2] میں پاتا ہے۔ اور آخرالذکر مقدم الذکر کے وسیلہ سے ظہور پاتا ہے۔ اور دونوں میں ربط ضبط۔ اور میل جول اخلاص باہمی کا رشتہ قایم ہو جاتا ہے۔

جرمنی کا ایک مشہور فلاسفر یعنے شیلنگ (۱۷۷۵ء سے ۱۸۵۴ء) اس طرح رقمطراز ہے " جو کچھ ہم جانتے ہیں۔ اور جو کچھ ہم نہیں جانتے۔ اِس کے درمیان

[1] فلسفۂ مذہب صفحہ ۲۹۶ [2] ڈاکٹر بی۔ کارپنٹر۔

جو اعلے ترین اتحاد پایا جاتا ہے۔ اس کے احساس اور علم کا نام مذہب ہے[1]۔"
یہ فلسفیانہ توضیح ہے۔ اور ایسے شخص کی ہے جو علم کا درجہ شناس تھا۔ مگر ہم اسے
سائنس ہی تک محدود نہیں کر سکتے۔ اسمیں سب قسم کا علم شامل ہے۔ مذہب
کی یہ کوشش رہتی ہے۔ کہ جہانتک بن پڑے۔ کامل نمونہ کو حاصل کرے
یعنے عابد کو معبود کی پاکیزگی اور کمال حاصل کرنے کی تحریک دے اور
اُسے نمونۂ کامل کے حصول میں مدد دے۔

جرمنی کا مشہور ترین فلاسفر اور آئیڈیل ازم کا بانی ایما نوئل کینٹ (۱۷۲۴ء
سے ۱۸۰۴ء) مذہب کے معنوی پہلو پر زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ
اُپنے تمام فرائض کو تسلیم کرنا گویا وہ احکام ربانی ہیں۔ مذہب ہے۔
اس کے نزدیک فرض سب سے مقدم ہے۔ اور اُس کی حقیقت غیر محدود
ہے۔ یہ فرض ہی ہے جو انسان کو چپکے چپکے آگے بڑھنے کی تحریک
کرتا رہتا ہے۔ اِس کے خیال میں اخلاق مذہب کا مترادف ہے۔ مگر
یاد رکھنا چاہیئے۔ کینٹ کا یہ خیال نہیں ہے۔ کہ فرائض اخلاقی
فرائض ہیں اور اسلیے وہ حکم ربانی پر قایم ہیں۔ اگر ایسی صورت ہو تو
اِس کے نزدیک یہ مذہب مکاشفہ ہوگا۔ برعکس اس کے وہ یہ کہتا ہے۔ چونکہ
ہم بطور خود جانتے ہیں کہ وہ فرائض ہیں اسواسطے ہم انہیں احکام یزدانی
سمجھتے ہیں۔ فِکٹ[2] جرمنی کا ایک نہایت نامور فلاسفر اور کینٹ کا جانشین کہتا ہے
مذہب بھی قابل عمل نہیں ہوتا اور اسکی علت غائی ہماری زندگیوں کی رہنمائی
کرنا نہیں ہے۔ روزانہ زندگی کی ہدایت کے واسطے اِس کے خیال میں خالص

---

[1] فراک جلد اول صفحہ ۵۵-۲۰!
[2] فچٹ ۱۷۶۲ء سے ۱۸۱۴ء

اخلاق بالکل کافی ہے۔ وہ کہتا ہے بگڑی ہوئی سوسائٹی ہی اسباب کی محتاج ہے کہ وہ مذہب کو اخلاقی طرز عمل کا محرک بنائے۔ پھر وہ کہتا ہے۔ مذہب کیا ہے۔ علم ہے۔ اس سے انسان اپنی اندرونی حالت سے آگاہ ہوتا اور اہم ترین سوالات کے جوابات بہم پہونچاتا ہے اور ہمارے دل کو کامل خوشی اور راحت اور نفس کو پاکیزگی بخشتا ہے۔ وہ کہتا ہے:" مذہب اخلاق ہے جسے ہم سب محسوس کرتے اور جانتے ہیں +

مذہب اخلاق کی زندہ طاقت ہے۔ جو اپنے تئیں متواتر اخلاقی کمال میں ظاہر کرتی رہتی ہے"[1] اس سے فرض کی غیر محدود حقیقت اور وسعت ظاہر ہو جاتی ہے۔ جو ایک اخلاقی کمال کے حصول پر ختم نہیں ہوتی۔ یہ ازلی اور غیر محدود ہے۔ یہ زندہ قوت ہے۔ جو برابر ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ فرض اور اس کے پس پشت جو طاقت ہے۔ اس کے درمیان شاندار رشتہ دوامی ہے۔ فرض کی آنکھ نہ صرف اپنے منبع اور مصدر ہی پر لگی رہتی ہے۔ بلکہ آگے کا بھی خیال رکھتی ہے ہمیشہ اور ہر آن اخلاقی کمالات کے حصول میں مشغول رہتی ہے۔ اسکی نوعیت میں دائمی ترقی کا عنصر پایا جاتا ہے +

اسپی نوزہ[2] جو یہودی اور ڈچ نسل کا ایک مشہور فلاسفر ہو گزرا ہے۔ کہتا ہے خدا کی محبت جو اس کے کمالات ربانی کے علم[3] پر مبنی ہو" مذہب ہے ایسی ہی

[1] ٹنیک۔ جلد اول صفحہ ۲۳

[2] اسپینوزا سنہ ۱۶۳۲ء میں پیدا ہوا۔ سنہ ۱۶۷۷ء میں انتقال کیا۔

[3] "گفٹ دیکچرز" صفحہ ۶۶

اخلاقی قوت کی تحریک اور رفاقت ظاہر کی گئی ہے۔ روح محبت کے رشتہ سے خدا سے واسطہ ہے۔ اِس تصور میں احتیاج بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اِس خیال سے وہ قوت بھی عیاں ہوتی ہے جو شکر آمیز محبت پیدا کر سکتی ہے یعنی عابد کی روح کے سامنے ایک محبوب موجود ہو جاتا ہے۔ کوئی تو زہ مذہب کو جذبات معنوی کا مجموعہ نہیں مانتا۔ اِن سب تعریفوں میں ایک غیر محدود ہستی جو ہمارے وجود سے بالکل جدا ہے۔ اور جو خود خدا یا اسکی برابر کا وجود ہے تسلیم کی گئی ہے۔

مشہور مورخ سر جان سیلے مصنف توسیع انگلستان" اپنی مشہور کتاب "نیچرل ریلیجن" میں لکھتا ہے۔ مذہب ہماری جبلی اور دائمی حمد و ثنا کی قوت[1] کا نام ہے"۔ یہ خیال پروفیسر ممدوح کا ناقص معلوم ہوتا ہے۔ جب ہم اور رو سے اسکا مقابلہ کرتے ہیں۔ مذہب نامعلوم شے کا تصور قایم کرتا ہے جس سے رشتہ قایم کرنا ممکن ہے۔ مذہب اوس عظیم طاقت کے وجود کا قائل ہے جو قدرت کے پس پشت ہے اور جس کے سامنے انسان سر تسلیم خم کرتا ہے۔ جرمنی کا سب سے مشہور فلاسفر مصنف گیٹی[2] کہتا ہے۔ "مذہب انسان کے اندر تین قسم کا احترام پیدا کرتا ہے جو کچھ اوپر ہے۔ اس کے لیے اور جو کچھ ارد گرد ہے۔ اِس کے واسطے اور جو کچھ نیچے ہے اِس کے لیے تکریم و تعظیم پیدا ہوتی ہے +

(باقی آیندہ)

---

[1] نیچرل ریلیجن" مطبوعہ ۱۸۸۲ء صفحہ ۴۷۰ چوتھی فصل۔ ۱۲

[2] گوئٹے ۱۷۴۹ء ۱۸۳۲ء

[3] نیچرل ریلیجن" پروفیسر میکس مولر صفحہ ۶۵۔ ۱۲

گنگا مائی

گنگا دنیا کے مشہور ترین دریاؤں میں سے ہے۔ ہندوستان کا بچہ بچہ اس کے نام سے واقف ہے۔ جس بچے کو یہ معلوم ہو کہ دریا کسے کہتے ہیں وہ یہ بھی ضرور جانتا ہوگا کہ گنگا کیا چیز ہے خصوصاً شمالی ہند میں تو اسکی اسقدر شہرت ہے کہ اِس کے نام سے گیت گائے جاتے ہیں بہت کم گیت ایسے ہوں گے جن میں سونے کی تھلیا اور گنگا جل کا مذکور نہو۔ سونے کی تھلیا اُس کی تعظیم کے واسطے ہے ورنہ مقصود اصلی گنگا جل ہے ✣

گنگا کا صاف ستھرا ٹھنڈا میٹھا اور مفید صحت پانی اپنی آپ نظیر ہے شیریں ایسا ہے کہ شاید کسی چشمہ کا پانی ایسا ہوگا۔ خنک ایسا کہ اِس کے آگے برف کی ضرورت نہیں شفاف ایسا کہ دو دو گز کی گہرائی تک ایک ایک کنکری تہہ میں پڑی ہوئی صاف نظر آسکے۔ ہاضم ایسا کہ سوڈا واٹر کو مات کرے۔ ہلکا ایسا کہ چاہے جتنا پی لو پیٹ میں بوجھ نہ معلوم ہو غرضکہ پانی میں جتنے اوصاف ہونے چاہئیں وہ سب آمیں بوجوہ احسن موجود ہیں۔ ایک اعلیٰ درجہ کی صفت یہ ہے کہ اگر احتیاط سے رکھ جائے تو برسوں خراب نہیں ہوتا۔ برخلاف اِس کے اور کسی جگہ کا پانی کتنی ہی احتیاط سے رکھو بہت جلد بگڑ جائے گا۔ یہی وجہ ہے جو ہندو اسکو اسقدر مقدس مانتے ہیں اور اس کی تعظیم کرتے ہیں۔ الحق کہ یہ دریا اپنی خوبیوں کی بدولت ہر طرح اِس تعظیم و تکریم کا مستحق ہے

دانایان ہند نے اِس کے سواحل کے مختلف مقامات پر میلے قایم کیئے ہیں جو مختلف اوقات میں ہوتے رہتے ہیں۔ اُن میں شامل ہونا موجب ثواب ٹھیرایا ہے۔ اِس غرض سے کہ جو لوگ دور و دراز مقامات کے رہنے والے ہیں وہ بھی میلہ کی شرکت کو کارِ ثواب سمجھکر سال میں کم سے کم ایک مرتبہ تو ضرور گنگا مائی کے درشن کریں اور اُس کا شستہ اور شریں جل پی کر اور اوس میں اشنان کر کے اُس کے خواص مفیدہ سے مستفید ہوں۔ علاوہ اِس افادہ کے سفر اور اجتماع سے جو معقول فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ یعنے تبدیلِ آب و ہوا تبادلۂ خیالات تجربات مشاہدات اور وسعت معلومات وغیرہ وہ مزید براں ہیں -

اِن میلوں کی شرکت کو کارِ ثواب اِس غرض سے قرار دیا ہے کہ باشندگان ہند کی طبائع کسی امر کو خوشی سے نہیں قبول کرتیں الا اُسکے جو منجانب مذہب ہو۔ علاوہ میلوں کی چند باتیں اور بھی ایسی مقرر کی ہیں۔ یعنے تیرتھ[۱] یاترہ وغیرہ جن کی وجہ سے لاکھوں آدمی بلا تعین[۲] اوقات گنگا جی پر آمد و رفت رکھتے ہیں۔ مثلاً ایک پھوکوں[۳] کا اُس میں ڈالنا ہے کہ اِس غرض سے لاکھوں معتقدان مذہب سینکڑوں کوس سے مردوں کی خوشام سوختہ لے کر آتے ہیں اور گنگا مائی کے پرتاب[۴] سے استفادہ کرتے ہیں +

گنگا جی کیلاش کے پہاڑوں سے نکلی ہیں جو ملک تبت میں جھیل مانسرور

---

[۱] سندر۔ اچھا۔ [۲] نرمل۔ بے میل صاف [۳] مقام متبرک۔ زیارت گاہ [۴] زیارت متبرکہ مقامات پر جانا [۵] مردہ کی جلی ہوئی ہڈیاں جنکو ہندو مردہ کو ثواب پہنچانے کی غرض سے گنگا میں ڈالتے ہیں۔ [۶] فیض برکت۔ ۱۲-

کے قریب ہیں اور ہردوار کے قریب دیس سے نکلکر پردیس میں قدم رکھا ہے یعنے پہاڑوں کو چھوڑ کر میدان کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اس مقام پر اور اس سے اوپر منبع کی طرف پانی بہت صاف و سرد ہے۔ اور جسقدر اوپر کی طرف جاؤ اُسے قدر ان دونوں اوصاف میں بیشی معلوم ہوگی۔ مگر دہانہ کی طرف یعنے میدانی حالت اس سے قدرے مختلف ہے۔ اُس طرف ان دونوں صفتوں میں کچھ کچھ کمی ہوتی جاتی ہے۔ خنکی تو آگے چلکر بالکل زائل ہو جاتی ہے مگر صفائی میں زیادہ کمی نہیں ہوتی۔

ہندوؤں کی مذہبی روایات کے بموجب اس دریا کی خلقت اور اجرا کے متعلق عجیب و غریب قصے مشہور ہیں جو بظاہر سراسر خلاف قیاس اور اسقدر غلط معلوم ہوتے ہیں کہ کوئی شخص اُن کو باور نہیں کرسکتا۔ واضح ہو کہ جملہ مذاہب عالم میں کم و بیش ایسی روایات ضرور ہیں جنسے بظاہر واقعات ناممکن الوقوع کا وقوع پذیر ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ مگر جب ارباب فہم اُنپر غوض کرتے ہیں تو عدم امکان کا خیال رفع ہو جاتا ہے۔ قرین عقل ہے کہ اس قصہ کا مطلب یہ نہو جو مضمون سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور کیا عجب ہے کہ یہ قصہ اسواسطے وضع کیا گیا ہو کہ لوگوں کے اعتقاد میں زیادتی ہو اور اُن کی توجہ اس متبرک دریا کی طرف زیادہ منعطف ہو۔

پہلے زمانہ میں جبکہ تہذیب و شائستگی کا ابتدائی دور تھا۔ تشبیہات و استعارات کی تصویریں بنا کر اپنا مطلب ظاہر کرتے تھے۔ خصوصاً ہندو۔ یونانی۔ مصری۔ اور رومی قومیں تو اس بات کی حاوی تھیں۔ اُن کے زمانہ میں عقل کا امتحان انہیں باتوں سے ہوتا تھا۔ جو شخص زیادہ صحیح تشبیہات اور سچے استعارات وضع کرتا وہ زیادہ عقلمند سمجھا جاتا۔

اور فی الواقع اسمیں عقل کا پورا امتحان ہو جاتا ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی تصاویر میں دیکھا ہوگا کہ بعض آدمیوں کے کئی کئی ہاتھ اور کئی کئی چہرے ہوتے ہیں۔ اِس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ دراصل ایک آدمی کے کئی ہاتھ یا کئی چہرہ ہیں۔ ایک شخص کے کئی ہاتھ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اُس میں کئی آدمیونکی قوت ہے۔ کیونکہ انسان کی قوت کا اظہار عموماً ہاتھ کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ جیسے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا لقب انکی غضنفری کی وجہ سے ید اللہ تھا۔ اگر تصویر میں ایک آدمی کے آٹھ ہاتھ بنائے جائیں تو اُسکا یہ مطلب ہے کہ اُس میں چار آدمیوں کے برابر طاقت ہے۔ اسیطرح ایک آدمی کے کئی چہرہ ہونے کے یہ معنے ہیں کہ اُس میں کئی آدمیوں کے ایسے اوصاف ہیں جو چشم و گوش۔ اور دماغ وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہندوؤں کے قدیم مصورین نے لنکا کے مشہور راجہ راون کی ایسی تصویر بنائی ہے جسمیں بیس ہاتھ اور گیارہ سر ہیں۔ دس سر آدمیوں کے سے ہیں ایک سر گدھے کا جیسا۔ دنیا میں کبھی کوئی آدمی اِس شکل کا نہیں ہوا مگر ناواقف ہنود یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ سچ مچ راون کے گیارہ سر اور بیس ہاتھ تھے اور اِسکی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ راکھشس[1] تھا حالانکہ صحیح یہ ہے کہ یہ صحیح نہیں۔ وہ بالکل ایسا ہی آدمی تھا جیسے اُس زمانہ میں اور تھے فرق صرف اتنا تھا کہ وہ غیر معمولی طاقت رکھتا تھا۔ اُس کی تصویر کے بیس ہاتھ اُس کی غیر معمولی طاقت کا اظہار کرتے ہیں۔ اِس زمانے میں بھی ایسے آدمی موجود ہیں جو تنہا کئی آدمیوں کی قوت رکھتے ہیں۔

[1] دیو۔

مدراس کے مشہور پہلوان پروفیسر رام موتی کی نسبت سنا ہے کہ وہ چلتی ہوئی موٹر کار کو پکڑ کر ٹھیرا لیتے ہیں۔ حالانکہ معمولی دس پندرہ آدمی بھی ملکر ایسا نہیں کر سکتے۔ تصویر کے دس سر جو آدمیوں جیسے ہیں راون کی دماغی قابلیت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور گیارہواں جو گدہے جیسا ہے اس کی حماقت کا تو وہ بڑا ودیا[۱]وان اور زبردست پنڈت تھا ہر پرکار[۲] کی ودیاؤں[۳] میں دخل رکھتا تھا۔ اسکی لیاقت ویدوں کی ایک ٹیکا[۴] کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے جو آجتک مستند ہے اور ایسی ہے کہ اب تک کسی سے ویسی نہیں لکھی گئی اور حماقت بھی اس سے ایسی سرزد ہوئی ہے کہ کبھی کسی سے نہ ہوئی ہوگی وہ حماقت اس سے سری[۵] رامچندر جی کی پیاری استری[۶] یعنی عصمت مآب وعفت انتساب سیتا جی کے بہکا کر لیجانے اور پھر رامچندر جی کے ساتھ جنگ کرنے کی شکل میں نمایاں ہوئی۔

مصر کے باشندے تصویریں بنا کر اپنا مطلب ظاہر کرتے تھے۔ ہر تصویر بجائے خود ایک مکمل جملہ ہوتی تھی اور اس طرح ترتیب وار بناتے تھے جس طرح تحریر میں ایک جملہ کے بعد دوسرا جملہ لکھتے ہیں۔

بعض دواؤں کے اشتہارات میں دیکھا ہے کہ ایک ہی آدمی کی دو تصویریں بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ ایک حالتِ مرض کی بہت ضعیف ونحیف دوسری حالتِ صحت کی نہایت توانا وتندرست۔ مطلب اسکا یہ ہوتا ہے کہ بیماری نے ایسی بری حالت کر دی تھی۔ مگر اس اشتہار کی دوا نے پھر اچھا کر دیا۔ مذہبی روایتوں میں جو باتیں بعید از عقل معلوم ہوتی ہیں وہ قریب تر از عقل ہوتی ہیں فقط سمجھے والوں کی سمجھ کا پھیر ہے۔

---

[۱] عالم۔ [۲] قسم۔ [۳] علم۔ [۴] تفسیر۔ [۵] بزرگ [۶] زوجہ۔ ۱۲۔

گنگا مائی کا قصہ دلچسپ سمجھنے کے واسطے راجہ اندر کا تھوڑا سا حال جاننا ضروری ہے۔ بغیر اسکے یہ قصہ اچھی طرح سمجھ میں نہیں آسکتا۔ لہذا مناسب ہے کہ پہلے اسکا حال مختصراً عرض کر دیا جائے +

(راجہ اندر کا حال)

یوں کہتے ہیں کہنے والے کہ اب سے بہت پہلے جس زمانہ کی کوئی تاریخ نہیں ہے اور نہ قیاس اُس کا اندازہ کر سکتا ہے ایک بڑا زبردست راجہ اندر کے نام سے گذرا ہے اُس نے اپنی عمر کا بڑا حصّہ سخت ترین عبادت و ریاضت میں صرف کیا اور ننانوے یگ[۱] کئے۔ خدا نے خوش ہو کر اس محنت شاقہ کے صلہ میں اُسکو جیتے جی آسمانی بادشاہت اور حیاتِ ابدی عطا فرمائی جن و پری دیو بھوت وغیرہ آتشی مخلوقات اُس کے قبضہ میں ہے۔ جملہ اسبابِ راحت ہر وقت اُس کے واسطے مہیا ہیں مگر ساتھ ہی اِس کے ایک ایسا فکر عظیم دامنگیر ہے جسکی وجہ سے کسی وقت بےفکری نصیب نہیں ہوتی۔ دنیا کی راحتوں کی طرح وہاں کی راحتیں بھی اُس کے واسطے رنج سے خالی نہیں۔ آسمانی بادشاہت میں بھی آسمان کے جور و جفا سے نجات نہ ملے۔ کیا خوب کہا ہے۔ حضرت سودا نے۔

[۱] یگ ایک قسم کی عبادت ہے جس میں لاکھوں آدمیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ لاکھوں روپیہ خیرات کرتے ہیں اور بہت سی آگ جلا کر اس میں خوشبوئیں ڈالتے ہیں۔ بخور کرتے ہیں۔ اور یگ کرنے کی حالت میں کسیکا کوئی سوال رد نہیں کرتے۔ یہ عبادت بڑے بڑے راجہ کرتے ہیں ۱۲

گنج کوئی مار سے خالی نہیں
دامن گل خار سے خالی نہیں

وہ فکر عظیم جو ہر وقت اُسکو بے چین رکھتا ہے یہ ہے کہ اُس کا یہ خیال ہے کہ جو شخص عبادت و ریاضت اور یگ کرنے میں اُس سے سبقت لیجائیگا وہ اُس کی جگہ آسمانی بادشاہت کا مالک ہو جائیگا۔ اسوجہ سے وہ ہمیشہ اِس خیال میں رہتا ہے کہ کوئی اُس سے بڑھنے نہ پائے جسکو زیادہ عبادت اور یگ کرتے ہوئے دیکھتا ہے اُسکو چھل بتّے دے کر کسی نہ کسی طرح گمراہ کردیتا ہے اور اُس کے یگ میں کھنڈت ڈالدیتا ہے۔ جن و پری کا وہ مالک ہے اور ایسے ایسے حور کے بچے۔ نور کے ٹکڑے اُس کے قبضہ میں ہیں جن کے حُسن گلوسوز سے بتان فرخار شرمندہ ہوتے ہیں۔ پس جسکو چاہتا ہے اُن کے ذریعہ سے دھوکا دیدیتا ہے۔ بڑے بڑے عبّاد و زہّاد کو صراط المستقیم سے ہٹا دیا۔ جس کی ایسی رعیت ہو اُس کے نزدیک کسیکو گمراہ کردینا کیا بڑی بات ہے۔

گنگا مائی کی پیدائش

سُنا ہے کہ پہلے زمانہ میں ایک راجہ تھا جسکا نام راجہ بل تھا ایک دفعہ اُس نے بڑا بھاری یگ کیا اطراف و اکناف عالم سے مخلوق آکر اسمیں شریک ہوئی۔ اُس یگ میں ایک غریب برہمن نے اِس کے سامنے آکر ڈنڈوت کی اور اشیرباد[1] دیکریوں ارداس[2] کی کہ ایشور پرماتما مہاراج

[1] اشیرباد۔ دعا۔ [2] ارداس۔ عرض۔ ۱۲

ادھیراج کو سدا سکھی رکھے جب سے شری برہما[1] جی نے اس سرشٹی[2] کو رچا ہے[3] تب سے آجتک کسی نے ایسا یگ نہیں کیا۔ لاکھوں کروڑوں کا دان پُن ہو رہا ہے دیس دیس چرچا ہے۔ میں بہت دکھی اور نردھن[4] آدمی ہوں۔ مجھپر بھی دیا ہو جائے راجہ نے کہا کہ پنڈت جی جو تمہارے من میں آئے لیلو۔ برہمن نے کہا کہ مہاراج میں کچھ اور نہیں چاہتا ایک ساڑھے تین پیر[5] دھرتی اپنے راج میں سے دے دو بڑی کرپا[6] ہوگی۔ اُسوقت راجہ کا گرو بھی وہاں موجود تھا اُسنے راجہ سے کہا کہ یہ برہمن نہیں ہے کوئی چھلیا ہے تجھے چھلتا ہے دیکھ اس کے چھل میں نہ آئیو اور ایک چپہ بھر زمین اسکو نہ دیجیو۔ مگر راجہ نے اُسکا کہنا نہ مانا اور کہا کہ اب میں نے یگ کیا ہے تو یہ مناسب نہیں کہ ایک برہمن کا سوال رد کر دوں۔ پھر شنکلپ[7] کرکے برہمن سے کہا کہ پنڈت جی تم شوق سے تین قدم زمین لے لو۔ برہمن نے پہلا ہی جو قدم رکھا وہ زمین سے آسمان پر پہنچا۔ وہاں برہما نے فوراً اُسکو دھوکر اُسکا پانی اپنے کمنڈل[8] میں رکھ لیا۔ کیونکہ اُس قدم میں پدم تھا۔ اور پدم سوائے خدا کے اور کسی کے پاؤں میں نہیں ہوتا۔ وہی پانی گنگا جی کی اصل ہے۔ اسیوجہ سے اس میں اسقدر اوصاف ہیں اور کیوں نہوں جبکہ وہ خدا کے پاؤں کا دھوون ہے +

---

[1] برہما۔ خالق۔ [2] سرشٹی۔ عالم۔ [3] رچا ہے۔ پیدا کیا ہے [4] نردھن مفلس [5] پیر۔ قدم [6] کرپا۔ مہربانی [7] شنکلپ۔ ایک چلو میں پانی لیکر کچھ منتر پڑھتے ہیں اور پھر اسکو زمین پر ڈالدیتے ہیں اِس کے یہ معنے کہ عہد واثق ہو گیا جیسے اِس زمانہ میں رجسٹری ہوتی ہے [8] کمنڈل۔ کشکول۔ ۱۲

گنگا جی کا نزول دنیا میں

روایت کرتے ہیں کرنے والے کہ اگلے وقتوں میں ایک راجہ تھا جسکا
نام راجہ سگر تھا وہ بڑا مہاتما[1] تھا۔ شام سویرے اجالے اندھیرے ہر گھڑی ہر پل
من میں ایشور کا دھیان رکھتا تھا۔ ایک دن اسکو یہ گیان[2] ہوا کہ کوئی چیز انسان کو
برے کرموں[3] کے پھل سے نہیں بچا سکتی۔ جو کچھ وہ کرے اسکا بھوگنا لازم
ہے اور دشوار ہے یہ کہ کوئی شخص اِس دار البوار میں سکون و قرار کے
ساتھ رہ سکے۔ علائق دنیوی میں پھنسکر برے کرموں سے محفوظ رہنا ازبس
مشکل ہے۔ اِس کی محبت اچھی نہیں۔ اَلدُّنْیَا جِیْفَۃٌ وَّطَالِبُہَا کِلَابٌ۔
پس اِس جیفہ و کثیفہ کا ترک[4] کرنا بہتر ہے۔ یہ خیال کر کے اپنے راج پاٹ کو
تیاگ[5] دیا اور راج دہانی[6] سے نکلکر دور دراز یورپ کے ملکوں میں چلا گیا۔
اور سمندر کے کنارہ بیٹھکر جپ تپ کرنے لگا۔ ہزاروں برس خشوع خضوع
کے ساتھ عبادت کی۔ اُس کے صلہ میں ایشور پرماتما نے اسکو یہ شکتی
عطا فرمائی کہ جسکو آنکھ اُٹھا کر دیکھ لے وہ فوراً بھسم[7] ہو جائے۔ کئی ہزار برس
کے بعد اُس کے خاندان میں ایک راجہ۔ راجہ تپھو کے نام سے ہوا۔
وہ بھی بہت نیک نفس اور خدا رسیدہ آدمی تھا ہر وقت من میں ایشور کی
چنتا[8] رکھتا تھا۔ اُس نے سویگ سے کئے اور آخر میں ایک اشومیدیگ[9] کیا۔

---

[1] مقدس۔ خداشناس [2] علم۔ عقل۔ [3] اعمال [4] ترک کردینا۔ چھوڑ دینا۔ ۱۲
[5] دار السلطنت۔ [6] راکھ [7] دھیان خیال۔ [8] اشو بر وزن سترو یعنی اسپ
میدھ بر وزن بید۔ اِس کے معنے ہیں اختلاف ہے۔ گر بیاں اِس کے معنے آزاد کرنے کے

جب راجہ اندر نے یہ دیکھا کہ راجہ تپہو عبادت اور یگ میں اُس کے برابر ہوگیا اور اشومید یگ کے پورے ہو جانے سے اُس سے بڑھ جائیگا اور اندراسن[۱] چھین لیگا تو اُسنے ارادہ کیا کہ کسی نہ کسی طرح اُس کے یگ میں رخنہ ڈال دے اور کوئی ایسی ترکیب کرے جس سے یگ نسپھل[۲] ہو جائے۔ جب یگ کے سمپورن[۳] ہونے میں بہت کم عرصہ رہگیا تو ایک ترکیب اُسکی سمجھ میں آئی اور اُسنے گھوڑے کو پکڑکر جہاں سگر کے پاس ایک درخت سے باندھ دیا۔ جو فوج گھوڑے کی حفاظت کے واسطے مامور تھی اُسنے راجہ کو خبر کی کہ گھوڑا یکایک غائب ہوگیا بہت تلاش کیا نہیں ملا۔ راجہ نے اپنے خاندان اور فوج کے آدمیوں کو جن کے تعداد ساٹھ ہزار تھی گھوڑے کو ڈھونڈنے کے واسطے بھیجا۔ اِس جم غفیر نے پہلے تین کھونٹ میں تلاش کیا۔ مگر کچھ سراغ نہ چلا۔ جب چوتھے کھونٹ میں گئے تو دیکھا کہ ایک بُڈھا آدمی آنکھیں نیدسے[؟] بیٹھا ہے اور رام نام کی مالا جپ رہا ہے اُنہوں نے دیکھکر کہا کہ دیکھو اِس مکار بڈھے کو کیسا ایشور کا بھگت[۴] بنا بیٹھا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۹) سمجھنے چاہئیں یگ بروزن رگ ایک قسم کی عبادت اُس کے معنے اِس مضمون میں عرض کیے جا چکے ہیں یہ ایک طرح کا یگ ہوتا ہے اور اسطرح ہوتا ہے کہ ایک بیش قیمت گھوڑے پر آلات حرب سجا کر اُسکو آزاد کر دیتے ہیں اور تھوڑی سی فوج اُسکی حفاظت کے واسطے مامور کیجاتی ہے۔ جہاں جہاں وہ گھوڑا گذرتا ہے وہاں وہاں اُس یگ کرنیوالے راجہ کی حکومت ہو جاتی ہے۔ اگر وہ گھوڑا کسی دوسرے راجہ کی حد میں چلا جائے اور وہ اُسکو پکڑ کر باندھ لے تو جنگ ہوتی ہے کیونکہ کوئی راجہ اپنی سلطنت کی ایک قدم زمین بھی بغیر جنگ کے کھونا نہیں کرنی چاہتا تو یگ کرنیوالے کا فرض ہے کہ تاریخ گرفتاری سے سال بھر کے اندر گھوڑے کو چھڑا لے۔ ورنہ یگ بے سود ہو جائے گا۔ [۱] اندر کی گدی۔ [۲] بے ثمر بے نتیجہ۔ [۳] مکمل۔ پورا [۴] معتقد۔

گھوڑا تو چرا کر باندھ لیا اور اب ہمکو دیکھہ کر آنکھیں بند کرکے رام رام کرنے لگا راجہ سگر نے جو آدمیوں کی آواز سنی تو آنکھہ اوٹھا کر دیکھا۔ نظر پڑتے ہی سب بھسم ہو گئے۔ جب راجہ تپھو کو یہ خبر وحشت اثر پہنچی تو بہت پریشان ہوا۔ گدی سے جی ہٹ گیا۔ اور جو لوگ بھسم ہو گئے تھے اون کی آتما کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے گنگا جل لانے کا قصد کیا۔ سلطنت چھوڑ کر پہاڑوں میں چلا گیا اور گنگا جل کے حاصل کرنے کی غرض سے دس ہزار برس تک عبادت کی۔ مگر ناکامیاب رہا۔ اور وہیں پہاڑوں میں گپت ہو گیا راجہ تپھو کے بعد اس کے خاندان میں راجہ بھاگیرت جی ہوئے اُنہوں نے بھی اپنے پتروں کی مکتی کے واسطے گنگا مائی کو دنیا میں لانے کا ارادہ کیا تا کہ اس کا جل اُن کے خاکستر پر چھڑکیں۔ اس غرض سے اُنہوں نے سری برہما جی کی تپشیا کی جن کے کمنڈل میں گنگا جی تھیں ایک مدت مدید اور عرصۂ بعید کے بعد برہما جی نے بھاگیرت جی کی تپشیا سے پرسن ہو کر یہ بردان دیا کہ گنگا تو تمکو ملے گی پرنتو پرتھوی میں اتنی شکتی نہیں کہ اسکو سہار سکے۔ تم شیو جی سے پرارتھنا کرو۔ بھاگیرت جی نے عرصۂ دراز تک شیو جی کی تپشیا کی تا آنکہ شیو جی نے خوش ہو کر فرمایا ہم تمہاری خاطر سے گنگا جی کو سہار لیں گے۔ چنانچہ گنگا بیکنٹھہ سے اوتر کر انکی جٹا میں آ گئی مگر ایک مدت تک اُنکی جٹا ہی میں رہی۔ بھاگیرت جی نے جب یہ دیکھا کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا تو بہت گھبرائے اور پھر شیو جی کی تپشیا کی با لآخر شیو جی اُن سے یہ کہا کہ تم نے ہماری بہت بھگتی کی ہے لو اب گنگا کو لیجاؤ یہ کہہ کر اپنی جٹا کا ایک بال توڑا۔ بال کے توڑتے ہی گنگا بہہ نکلی۔ اور اب تک بہہ رہی ہے۔ اور جبتک ایشور پرماتما کی اچھا ہے یونہیں بہتی رہے گی۔ اسعد حسین۔

"وہ"

کھانے سے فارغ ہو اور ننھے کو ساتھ گاڑی میں بٹھا "وہ" تو کچہری کی طرف روانہ ہوئے اور میں اپنے کمرہ میں جا کر ناصر دلہن کے خط کا جواب لکھنے بیٹھی۔ انکا خط آئے ہوئے کئی دن ہو گئے تھے۔ مگر اس بے قیصر نے اتنی فرصت نہ لینے دی کہ چین سے بیٹھکر دو سطریں تو لکھدیتی۔ بارے آج خدا خدا کرکے اُسکو باپ کے ساتھ کر دیا۔ "وہ" تو بہتیرا کہتے رہے کہ میں اپنے ساتھ نہیں لے جاتا۔ میرا کچھ ٹھیک نہیں گھڑی بھر میں ضلع میں ہونگا گھڑی میں ڈویژنل کورٹ جانا پڑے گا یہ کہاں کہاں میرے ہمراہ پھریگا۔ مگر جب میں نے خفا ہوکر کہا کہ اگر قیصر کی جان تم کو ایسی دوبھر معلوم ہوتی ہے تو لیجانے کی کچھ ضرورت نہیں۔ اِس پر اُن کو سوائے اِس کے اور کچھ جواب نہ بن آیا کہ میں تو اِسی کی خاطر کہتا تھا کہ خواہ مخواہ ہلکان ہوگا قیصر کو میں نے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ اگر آ کا میاں نہ لے چلیں تو تم ضد کرکے ساتھ جانا۔ غرض اِس طرح بڑی مشکل سے باپ بیٹوں کو اُدھر روانہ کرکے جواب لکھنے کے لیے کچھ وقت نکالا۔

ناصر دلہن کا خط ماشاء اللہ ایک سوختہ کا دفتر تھا۔ انکی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور چونکہ خود علاوہ ذہین ہونے کے موجودہ روش کیموافق اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں اور میری اُن کی اکثر پردہ اور دیگر رسوم قبیحہ پر بحث ہوا کرتی تھی اِسی لیے اِس خط کا جواب جو اُنہوں نے شادی کے بعد پہلی مرتبہ لکھا تھا خصوصیت کے ساتھ غور طلب تھا زیادہ اسوجہ سے

کہ اوس میں وہ قلبی جذبات مندرج تھے جن کا احساس کم وبیش ہر روشن خیال لڑکی کو شادی کے بعد ہوتا ہے۔ اور میں یہ چاہتی تھی کہ اس کے جواب میں اُن کی دلچسپ تحریر پر ایک معقول ریویو بھیجوں۔ انکی دلچسپی کا انداز اِن چند فقروں سے ہو سکتا ہے جو میں ذیل میں تحریر کرتی ہوں :-

"کل تیسرے پہر کو اماں جان تو اپنی بھاوج کی خیر صلاح کو گئیں وہ عرصے سے بیمار ہیں۔ کوئی کہتا ہے دق ہو گئی ہے کوئی کہتا ہے جگر کا فعل خراب ہے غرض جتنے منہ اُتنی باتیں اللہ اُن کو جلد شفا دے۔ امان جان سے چلتے چلتے میں نے کہدیا تھا کہ آپ شام تک ضرور واپس تشریف لے آئیں اُنہوں نے کہا دیکھو بیٹی! جیسا موقع ہو گا ویسا کروں گی مگر مجھکو دکھائی نہیں دیتا کہ وہ لوگ آج آنے دیں گے۔ اِن کے جانے سے گھر میں فقط میں اور نصیرہ (میری نند) باقی رہگئے نوکروں میں بی مغلانی نصیرہ کی دودا۔ گھر کی ماما اور میری ساتھ والی یہ چار آدمی تھے۔ اتنا بڑا گھر اماں جان کے نہونے سے سونا معلوم ہونے لگا۔ اصل یہ ہے کہ کسی بزرگ کے گھر میں ہونے سے کچھ دل کو اطمینان سا رہتا ہے۔ تم میری طبیعت سے واقف ہو۔ میں اُن لڑکیوں کی طرح نہیں ہوں جو خواہ مخواہ ساس کی دشمن بنجاتی ہیں اور ماں بیٹوں میں تفرقہ ڈلوا دیتی ہیں۔ دوسرے میری ساس بھی تمہاری اماں جان کی طرح خوش مزاج ہیں اور میرا دل رکھنے کے لیئے کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتیں۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ سمجھو میں نے

جس میں یہ تمہید اوٹھائی ہے اُس کے مقطع کا بند یہ ہے کہ میدان خالی دیکھکر ناصر نے کہا کہ آج میں تمکو ضرور تماشے میں لے چلوں گا اتنے دنوں سے میں موقع کی تاک میں تھا کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے جو اماں جان ایک رات کی رات کہیں ملنے چلی جائیں۔ اسپر میں نے جواب دیا۔ ناصر! تمھاری تو عقل جاتی رہی ہے اگر اماں جان کے کان میں اِس کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ بہت ناراض ہوں گی۔ تم تو مرد ہو کے چھوٹ جاؤ گے اور میری شامت آئے گی۔ وہ مجھے یہ نہ کہیں گی کہ بیٹی اگر یہ بیوقوف تھا تو تم تو ماشاراللہ پڑھی لکھی ہوشیار تھیں تم نے اتنی بات نہ سوچی کہ شریفوں کی بہو بیٹیاں ناچ رنگ تھیٹر ویٹر میں نہیں جایا کرتیں۔ تو بھلا بتاؤ میں کیا جواب دوں گی۔ وہ بولے "ڈیر کزن" میں تو تمکو اتنا کنسرویٹو نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے کہا مجکو تمہاری اِس عادت سے صد نفرت ہے کہ اپنی سیدھی سادھی زبان میں خواہ مخواہ انگریزی کے الفاظ ٹھونس دیتے ہو۔ اسکا سننے والوں پر فقط یہ اثر ہوتا ہے کہ نہ تم کو اپنی زبان آتی ہو اور نہ انگریزی کا حق ادا کرتے ہو۔ خیر مختصر یہ کہ مجکو چاہے دقیانوسی خیال کہو اور چاہے روشن خیال مگر مجھ سے ہرگز یہ نہیں ہونے کا کہ بغیر اماں جان کی اجازت لیئے تمہارے کہنے میں آکر تھیٹر چلی چلوں۔ اگر ایسا ہی لے جانے کے لیے دل بیقرار ہا ہے تو اپنی والدہ صاحبہ کی خوشامد درآمد

کرکے اُن کو راضی کرلو۔ مگر اِن کے سر پر تماشے کا کچھ ایسا
جن سوار تھا کہ میرے کہے کا خاک اثر نہوا۔ اور جب یہ دیکھا کہ
میں دلیلوں سے قابو میں آنے والی نہیں تو آخر قسموں پر اُتر
آئے اور کہنے لگے کنیزہ اگر تمہیں میرا مردہ ہی دیکھنا نصیب
ہو جواب سے کے چلنے سے انکار کرو۔ میں نے بیتاب دونوں
ہاتھوں سے منہ بھینچا کہ یہ الفاظ اُن کی زبان سے نہ نکلیں
مگر بھلا کہاں میں اور کہاں وہ۔ چار و ناچار۔ اُن کا کہا ماننا
پڑا۔ تم ہی بتاؤ اِس حالت میں اگر برابر انکار کئے جاتی تو
خدانخواستہ اِن کے دشمنوں کا مردہ دیکھنا تو مقصود
تھا ہی نہیں .... وغیرہ وغیرہ"

غرض اِس طرح کی پُر لطف باتوں سے سارا خط بھرا پڑا تھا۔ مگر مجھکو
جس سے اچنبہ ہوا وہ کنیزہ کا طرز خطاب تھا۔ یعنی انکا خاوند کا نام لے کر
پکارنا۔ جواب خط تو میں نے لکھکر ڈالوا دیا۔ مگر اُس کے بعد دیر تک
اِسی مسئلہ پر غور کرتی رہی کہ ہم ہندوستانیوں کو یہ زیبا ہے کہ میاں
بیوی آپس میں نام لے کر پکاریں یا نہیں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ دیکھو! مجھے
آج بیاہے ہوئے پورے تین سال ہونے کو آئے مگر میں نے آجتک
کبھی اُن کا نام لے کر نہیں پکارا۔ اور نہ انہوں نے یہ زور دیا کہ تم میرا نام
لے کر پکارا کرو۔ آخر ماشاء اللہ وہ بھی تو ناصر کی طرح تین سال ولایت
میں رہ آئے ہیں۔ اور اُن کے دماغ میں جو آزاد خیالی ہے وہ تو میں
جانتی ہوں شاید ہی کسی میں ہو پھر اُن کا اِس معاملہ پر خاموش
رہنا ضرور کوئی نہ کوئی معنے رکھتا ہے۔ اِسی لیے یہ سوچکر بیٹھ گئی کہ

آج شام کو اس کا تذکرہ کروں گی چونکہ اتنے عرصہ سے کبھی نام نہیں لیا تھا
دل ہی دل میں اُن کا نام پھیر رہا تھا۔ لیکن زبان سے نہ نکلتا تھا میں نے
بہتیری کوشش کی کہ کئی دفعہ پکار پکار کر ان کا نام لوں تاکہ مشق ہو جائے
اور اگر اُن کی خوشی اسی میں ہوئی کہ میرا نام لیا جائے تو کچاپن نہ پایا جائے
مگر دل میں کچھ ایسی ہچکچاہٹ بیٹھ گئی تھی کہ زبان سے حرف نہ نکلتے تھے
میں نے تنگ آ کر قلم اوٹھایا ایک کاغذ کے پرچے پر اُن کا نام لکھنا شروع
کر دیا اور بار بار اُس کو پڑھنے لگی جب جا کے اتنی مہارت ہوئی کہ بے تامل
دو ایک دفعہ خود بخود نام زبان پر آ جاتا ہے۔ اِس نام کے ساتھ شادی
کے بعد کی ساری زندگی میری آنکھوں کے سامنے پھر گئی اور اُن کی
ذرا ذرا سی بات کا رہ رہ کے خیال آنے لگا۔ اول ہی روز سے جو آزادی
انہوں نے مجھکو دے رکھی ہے اس کی میں تہ دل سے مشکور ہوں۔ اگرچہ
کبھی اُن کے منہ پر شکریہ کا اظہار نہیں کیا۔ میرے ساتھ ایسے ادب سے
پیش آتے ہیں جیسے کوئی شاہی دربار میں اپنے رتبہ کا خیال رکھتا ہو
چھٹپن میں۔ میں سنا کرتی تھی کہ جو لڑکا ولایت ہو آتا ہے اُس کا دماغ
ساتویں آسمان پر پہونچ جاتا ہے اور وہ کسیکو خاطر میں نہیں لاتا اِس لیے
بیاہ سے پہلے جب کبھی خیال آتا تھا کہ یہ ولایت ہو آئے ہیں تو سہم کے
مارے میری روح فنا ہو جاتی تھی۔ یہی سوچتی تھی کہ دیکھئے تقدیر میں
کیا لکھا ہے۔ کہیں ایسا نہو کہ ولایت کی ساری خرابیوں کی پوٹ میرے
پلے پڑے اور مجھکو دنیا ہی میں دوزخ ہو جائے۔ مگر شکر ہے اُس
پاک پروردگار کا کہ اُس نے میری فریاد سن لی۔ اور ایسا شوہر دیا۔ جو
میرے خواب و خیال میں بھی نہ آ سکتا تھا۔ البتہ ولایت نے جو ان میں

نرالی بات پیدا کر دی وہ یہ ہے کہ جب مجھ پر بہت مہربان ہوتے ہیں تو اپنی
محبت جتانے میں کسیکا لحاظ نہیں کرتے اور نہ اُن کو ایسی بات کی پرواہ ہوتی
ہوتی ہے کہ لوگ دیکھیں گے تو نام رکھیں گے چنانچہ اکثر صبح و شام دوپہر
جب اُن کا جی چاہے بے تامل میری پیشانی کو کسی ولی اللہ کی درگاہ کی
چوکھٹ سمجھ لیتے ہیں اور جو میں غصہ ہو کر کہتی ہوں کہ خدا نے تمہارے
دیدے میں حیا و شرم تو دی ہی نہیں تو بے غیرتی سے اُسکا یہ جواب
ملتا ہے کہ میں تو فقط اللہ اور رسول کا حکم بجا لاتا ہوں۔ اگر میں اپنی سچی
محبت کا اظہار کرتا ہوں تو بتاؤ کسی گناہ کا سزاوار ہوں؟ اس پر جل کر
میں یہی جواب دیتی ہوں کہ اللہ رسول نے کہیں یہ بھی نہیں فرمایا کہ تم
اپنی بیوی کے چہرے کو سب کے سامنے سنگِ اسود ہی بنا بیٹھو۔ بلا سے
میری رنگت سیاہ فام ہوتی کہ تمکو بہانہ ملجاتا۔ خیر لوگ چاہے اُن کی اِس
بے حجابی پر کچھ ہی نام دھریں مگر میں دل سے ناپسند نہیں کرتی۔ بلکہ اکثر
خوش ہوتی ہوں یہ بات اور ہے کہ تا دمِ تحریر اُنپر یہ نہیں ظاہر ہونے
دیا کہ میری رائے اُن کی حرکات کیمو افقت میں ہے اُن کو اب تک
یہ یقین کامل ہے کہ میں در اصل ناپسند کرتی ہوں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ اگر
میری تیوری پر ذرا سا بل آجائے تو بھلا مجال ہے کہ وہ کسی بات کی جرأت
کر سکیں میرے دل کی کیفیت معلوم کرنے میں جو ملکہ اُن کو حاصل ہے
اُسے دیکھکر مجھکو تعجب ہوتا ہے کہ مرد ذات ہو کر کیونکہ اسقدر کمال حاصل کرلیا
کہ میری طبیعت کے ہر پہلو سے واقفیت ہے جس طرف میرا
میلان دیکھنا اُدھر ہی خود بھی رجوع ہو جانا اور ہر وقت مجھکو خوش وخرم
رکھنے کی کوشش کرنا اس بات کی بین دلیل ہے کہ انگلستان کی ساری

خوبیاں اُن میں مجتمع ہوگئی ہیں۔ مگر ان تمام باتوں سے لوگ یہ نہ سمجھیں کہ میری اُن کی لڑائی نہیں ہوتی۔ خوب ہوتی ہے۔ اُس کی بنا یہ ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ پڑھے ہوئے ہیں اور اِس میں شک نہیں کہ اُنکی قابلیت کا مقابلہ میرے فرشتے بھی نہیں کر سکتے۔ مگر میری عادت یہ ہے کہ جو بات ایک دفعہ دماغ میں بیٹھ جائے وہ بڑی مشکل سے نکلتی ہے اور اِسی پر میری اُن کی بحث ہوتی ہے۔ مثلاً کئی روز کا ذکر ہے کہ وہ تو اپنے کمرہ میں بیٹھے مقدمات کے کاغذات دیکھ رہے تھے اور میں اپنے مطالعہ کے کمرہ میں امیر مینائی کا دیوان دیکھ رہی تھی۔ ہاں اِس سے پہلے میری اُنکی اِس بات پر دو بدو ہو چکی تھی کہ امیر داغ سے بہتر ہے وہ کہتے تھے کہ نہیں داغ کا رتبہ اعلیٰ تریں ہے۔ اثنائے مطالعہ میں میری نظر اِس شعر پر پڑی۔

خاموش ہیں لحد میں جو لوگ خوش بیاں تھے
غنچوں کے وہ دہن ہیں بلبل کی جو زباں تھے

میں نے جھٹ اُنکو آواز دی کہ ذرا یہاں ہو جاؤ۔ وہ دوڑے دوڑے آئے میں نے مذکورہ بالا شعر دکھا کر کہا کہ کبھی تمہارے داغ کو بھی ایسا شعر لکھنا نصیب ہوا ہے۔ دیکھو کتنا سچا مضمون کن رعایتوں سے اور کن مختصر اور شستہ الفاظ میں باندھا ہے اِس پر وہ بولے کہ البتہ شعر اچھا ہے مگر اس سے بہتر بہتر ہزاروں شعر داغ کے دیوان میں موجود ہیں۔ مگر میں یہی کہے گئی کہ تم ایک بھی نہیں دکھا سکتے۔ غرض اِس پر بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھی کہ میں خفا ہو گئی۔ انہوں نے داغ کا دیوان الٹ پلٹ کر سینکڑوں شعر میرے آگے ڈالدیئے میں نے بھی امیر مینائی کے عمدہ سے عمدہ جواہر اُن کے آگے بکھیر دیئے اور ساتھ ہی یہ چبھتا ہوا فقرہ بھی کہدیا کہ وہ جو انگریزی

مین گائے کے سامنے موتی بکھیرنے کی نقل ہے وہ تم پر صادق ہو رہی ہے۔ اسپر وہ بولے کہ خدا جانے مجھپر ہو رہی ہے یا تمپر۔ میں پھر یہی کہونگا کہ جیات تم کو ایکدفعہ بھلی معلوم ہوا اس کی تعریف کرتے کرتے آسمان چڑھا دیتی ہو۔ میں امیر کو بُرا نہیں کہتا اپنے زمانہ کا استاد تھا۔ مگر داغ پر اُسکو فوقیت دینا جہالت کی نشانی ہے جہالت کا نام سنکر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور طنزاً میں نے جواب دیا۔ کہ خیر میں جاہل ہی سہی آپ تو بڑے عالم ہیں۔ مگر میں یہ جانتی ہوں کہ اُردو زبان سمجھنے کی تمکو خاک تمیز نہیں۔ وہ بولے کہ اب آپ سے سبق لینا شروع کروں گا۔ ہاں تو استانی جی غالب کے اِس شعر کے کیا معنی ہیں۔

رکھا غفلت نے دور افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ
اشارت فہم کو ہر ناخنِ بُریدہ ابرو تھا

اِس پر میں اور بھی جھنجھلائی کیونکہ غالب کا یہ شعر جس کے معنے صاف ہیں میرے جلانے کو اِس لیے پوچھا کہ گویا مجھکو اِس سیدھے سادے شعر کے معنی بھی نہیں آتے۔ غرض جب اِس طرح کی چھیڑ کر کرکے مجکو خوب ستالیا تو معافی کی درخواست ہوئی اُس کے جواب میں میں نے کہا کہ بس اب تم مجھ سے بات نہ کرنا اور یہ کہکر کمرہ میں سے اُٹھ باہر دالان میں اُسی روز خالہ جان آئی ہوئی تھیں اُن کے پاس جا بیٹھی وہ کہتے ہی رہے کہ بات تو سنو۔ بات تو سنو۔ غصہ ہر وقت ناک پر دھرا رہتا ہے میں آپسے بحث کرتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ مگر میں نے ایک نہ سنی۔ اس کے بعد ایک روز تک میں مطلق نہیں بولی۔ میری شکایت اپنی اماں جان کے پاس لے گئے کہ آپ کی بہو صاحبہ مجھسے ناراض ہیں۔ اور کل سے ابتک بات نہیں کی آپ ہی سفارش کرکے میرا قصور معاف کرا دیجئے۔ اُن کے سامنے تو

ماں جان میری طرف ہو کر بولتی ہیں کہ بیٹا تو ہر وقت اسکو چھیڑتا رہتا ہے اِس لئے
اس کی خفگی بجا ہے مگر بعد میں مجھکو اپنے طور پر سمجھا دیتی ہیں کہ خاوند کا دل
میلا کرنا اچھی بات نہیں مگر میں خود جانتی ہوں کہ میری خفگی کوئی سچ مچ کی
تھوڑا ہی ہوتی ہے دوسرے ان کو اس میں خود مزا آتا ہے۔ بلکہ میں تو اپنے
اپنی خوش قسمتی سمجھتی ہوں کہ ایک خاوند ملا جو علمی معاملات میں بہت سے موقعوں پر
مجھسے اختلاف رائے رکھتا ہے۔ مجھے ایسا شوہر ہرگز پسند نہیں
کہ جو بیوی کا فقط ہاں جی کا نوکر ہو۔ اور اپنی گرہ کی قابلیت نہ رکھتا ہو۔ دوسرے
ہم دونوں کی یہ عادت ہے کہ مثلاً میں کوئی کتاب پڑھ رہی ہوں اور اسمیں
کوئی نفیس مضمون ہے جو مجھکو بھلا معلوم ہوتا ہے تو مجھے اُس وقت تک
چین نہیں آنے کا جب تک وہ مضمون اُن کو نہ دکھا لوں اور وہ تعریف
نہ کر دیں اسیطرح جب کبھی کوئی شعر یا مضمون ان کو اچھا معلوم ہوتا ہے
تو وہ مجھکو ضرور دکھاتے ہیں اور اُس کی تعریف چاہتے ہیں اور
اگر ایک بات کو میں اچھا کہوں اور وہ مجھ سے اتفاق نہ کریں تو لڑائی
ہوتی ہے مگر آخر میں وہی زبر رہتے ہیں کیونکہ درحقیقت اکثر میں
غلطی پر ہوتی ہوں جیسا کہ بعد میں وہ ثابت کر دیتے ہیں۔ میں یہ دیکھتی
ہوں کہ شادی کے یہ تین سال مجھکو پہاڑ معلوم ہوتے اگر میری اُنکی
ہفتے میں دو ایک دفعہ لڑائی نہ ہوتی رہتی لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ جیسے کل ہی شادی ہوئی ہے کیونکہ ہر اختلاف کے بعد محبت
دُگنی ہو جاتی ہے۔ یہ بھی نہیں ہے کہ ساری خفگی میرے ہی حصہ میں
آگئی ہے الحمد کہ وہ بھی خفا ہو جاتے ہیں مگر ان کی ناراضگی فقط
دو ایک ہی گھنٹے تک رہتی ہے جہاں میں نے دو ایک چھینٹے دیئے

اور ٹھنڈے پڑ گئے اسوقت میں اور کہو کے دیتی ہوں کہ بس یہی خفگی تھی دو تین روز تک تو اور روٹھے رہتے۔ ہماری محبت کا نقشہ کاغذ پر کھینچا جائے تو اسکی شکل اِس لکیر کی سی ہو گی

اخلاص
شکر رنجی
شادی

مگر بعض میاں بیوی میں ایسی محبت ہوتی ہے جیسے خط مستقیم

اخلاص یا لڑائی ——— شادی

کہ اگر محبت ہے تو وہ یکساں ایک حالت پر چلی جاتی ہے کہیں اُتار چڑھاؤ نہیں اور اگر خدانخواستہ ناسازگاری ہے تو بھی ایک حالت مگر میری اور اُن کی ایسی طبیعت واقع نہیں ہوئی ہے کہ محبت کی سیدھی مگر خشک اور غیر دلچسپ راہ پر برابر چلے جائیں اگر چھیڑ کرنے کے لیے کوئی سامان نہیں ملتا تو وہ کوئی ایسا شگوفہ کھڑا کر لیتی ہیں جسپر خواہ مخواہ میں روٹھوں چنانچہ مہینا بھر کا ذکر ہے کہ ہم کو طلاپ سے رہتے رہتے دو ہفتے ہو گئے تھے اور کوئی بات چھیڑ کی نہیں نکلی تھی۔ اِس سے میری طبیعت اکتا گئی اور انکا بھی جی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح مجھکو چھیڑیں۔ ایکدن میں بہت رات گئے سوئی تھی اور اِس لیے صبحکو معمول سے زیادہ دیر میں اٹھی خیر اُس دن تو مجھکو کچھ خبر نہیں ہوئی دوسرے دن کیا دیکھتی ہوں کہ ان کے ہاتھ میں ایک فوٹو ہے اور اُسکی تعریفیں پہ تعریفیں ہو رہی ہیں۔ اسپر میں نے کہا کہ لاؤ میں بھی تو دیکھوں کہ کیسی تصویر ہے۔ کہنے لگے تمہارے دکھانے کی نہیں ہے تم دیکھو گی تو مارے حسد کے آگ بگولا ہو جاؤ گی میں بولی حسد کرے میری بلا آخر مجھے بھی تو بتاؤ کہ قصہ کیا ہے؟ اسپر آپنے نہایت متین صورت بنا کے کہنا شروع کیا کہ بات اصل یہ ہے کہ میری تمہاری تو نبتی نہیں اور نہ آیندہ نبھنے کی امید اِس لیے میرا ارادہ ہے کہ دوسری شادی کر دوں اور اب کے اچھی طرح دیکھ بھال کے بات ٹھیرائی ہے چنانچہ یہ تصویر اُسی لڑکی کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ تصویر دور سے اپنے

ہاتھ میں سے کر مجھکو دکھائی - اُس میں ایک عورت سر سے پاؤں تک دوشالہ اوڑھے پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی میں بولی کہ خیر دوسری شادی کرنی تمکو جم جم نصیب اللہ کرے چار اور کرو - مجھے جلنے کی کیا پڑی - حسد کرے میری جوتی کی نوک مگر اس فوٹو میں تمہاری چاہیتی کا نہ منہ کھلا ہے نہ ہاتھ - یہ کیونکر معلوم ہو کہ وہ چندے آفتاب چندے ماہتاب ہیں جنپر آپکی ایسی طبیعت ریجھی ہے کہنے لگے جب وہ رشک قمر تمہارے سامنے آجائے گی تو خود دیکھ لوگی اگرچہ میں جانتی تھی کہ فقط مذاق کر رہے ہیں مگر اُن کا یہ کہنا کہ یہ تصویر بڑی شکل سے سوتے میں لی گئی ہے کیونکہ جاگتے میں تو وہ ہرگز نہیں لواتی مذاق کو درجہ شبہ تک پہونچاتا تھا اور اِس خیال سے میں کچھ چین بجبیں ہوگئی بس پھر کیا تھا اُن کی بن آئی اور مجھکو خوب بطر کانا شروع کیا یہاں تک کہ میں جل بھن کے پلنگ پر جا منہ ڈھانک کے چپکے چپکے رونے لگی - اسپر اُن کو تاب نہیں رہی اور دوڑے دوڑے آنکر تسلی وہ باتیں کرنے لگے مگر منہ پہ ہنسی کھیل رہی تھی اس سے مجھے اور بھی غصہ آیا - اور میں نے کہا جاؤ تمکو مجھ سے کیا کام اپنی پسند والی سے جا کر ایسی خوشامد کی باتیں کرو - بڑی دیر کے بعد جب اونہوں نے خوب دل بھر کے ستا لیا تو کہا ایکدفعہ تصویر کو قریب سے اور دیکھ لو - اور کہو تو میں یہاں بلا کر اس خود کو تمہیں دکھاؤں میں نے کہا جی نہیں مجھے کچھ ایسی ضرورت نہیں - مگر تصویر کو دیکھتی ہوں تو اُس میں میرا ہی دوشالہ وہی شبنمی اور پلنگ اور اپنے ہی گھر کی سامنے کی دیوار اب مجپر عقدہ کھل گیا کہ یہ اُس روز جو میں دیر میں اُٹھی تھی تو اُنہوں نے مجھ سوتی کا فوٹو لیا - پھر آپنے مجھکو آئینے کے سامنے لیجا کر کھڑا کر دیا کہ دیکھو یہ وہی ماہ جبین ہے - میں نے کہا ہٹو مجھے ایسی خوشامدوں کی باتیں

پسند نہیں اُس کے بعد سے میں کبھی ان کے دہوکے میں نہیں آئی اگرچہ لڑائی تو کئی دفعہ ہوئی ہے۔ مختصر یہ کہ اِسی قسم کے تمام گذشتہ واقعات میرے دلمیں سے گذر رہے تھے اور جو جو میں اِن کا خیال کرتی تھی وہ وہ مجھکو اُنکی قدر ہوتی تھی اور دل سے بے اختیار یہی دعا نکلتی تھی کہ خدا ہمیشہ ہمیشہ اُن کو خوش و خرم رکھے اور مجکو اُنکی خدمت کی توفیق دے مجھے اِن خیالوں میں مستغرق بیٹھے ہوئے دو گھنٹے گزر گئے اِس بیچ اماں جان نے ماما سے پوچھا نصیبن دیکھنا بہو آرام کرتی ہیں یا اپنے کمرہ میں ہیں اُس نے کہا چھوٹی بیوی کمرہ میں میز پر سر جھکائے بیٹھی ہیں۔ اسپر اماں جان آنکر یوں مخاطب ہوئیں کہ بیٹی کیسی طبیعت ہے مغموم کیوں بیٹھی ہو۔ میں بولی جی نہیں اماں جان میں مغموم تو نہیں ہوں ایک مضمون سوچ رہی ہوں آج آپکے صاحبزادے سے اُس پر بحث کرونگی۔ بحث کا نام سنکر بیٹے کی محبت نے زور کیا اور کہنے لگیں کہ بیٹی ایک تو پہلے ہی دہاں سے وہ تھکا ماندہ آئے گا یہ مقدمے واسئے اسکا بھیجا کھا جاتے ہیں اور پھر تم بحث کرنی شروع کرو گی۔ دن بدن دُبلا ہوا جاتا ہے میرا کئی دفعے ارادہ ہو رہا تھا کہ تم کو سمجھاؤں کہ اُس کے آرام کا خیال رکھو اور اُس سے خواہ مخواہ نہ اُلجھا کرو۔ اُدھر عدالت میں وہ اپنا مغز خالی کرتا ہے اِدھر تم سے کچھ بحثی ہوتی ہے آخر وہ آدمی ہے کتے کا بھیجا کہاں سے لائے جو ہر وقت ہر بات کی جوابدہی کرتا رہے۔ اُس پر طرہ یہ کہ اگر کچھ ایسی ویسی بات ہو جائے تو تم ناراض ہو جاتی ہو اُسکا الگ صدمہ ہوتا ہے۔ غریب کی جان تو آئی میں ہے اگر بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں کہ تم نے تو اپنے خاوند کو جتی میں رکھہ کر پہن ڈالا ہے وہ تمہارے ہی آسائش کے لیے ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھتا ہے اور تمہاری خوشی ..... لیے کوئی وقیقہ اٹھا نہیں رکھتا۔ روپے کو پانی بنا رکھا ہے کہ

کسی طرح سے تمھارا دل میلا نہو مگر تم ہو کہ کسی بات کو خاطر میں نہیں لاتیں۔ دیکھو بیٹی میں
تمھاری دشمن نہیں ہوں تم میرے گھر کی روشنی ہو میری اس سے زیادہ اور کیا آرزو
ہوسکتی ہے کہ تم دونوں کو ہنسی خوشی دیکھوں۔ میں جو کچھہ تم کو صلاح نصیحت کرتی
ہوں وہ تمہارے ہی فائدے کے لیے۔ جب اتنے دن سے دیکھہ رہی ہوں کہ
یہ گت سب کر نچے کی ہوئی ہو تب آج ڈرتے ڈرتے زبان کھولی ہے کہ شاید
تم پر کچھہ اثر ہو۔ وہ تو تمھاری چاہت میں اندھا ہو رہا ہے نہ اُسکو اپنے تن کا ہوش
ہے نہ بدن کا جیسا تم نے کھلا دیا کھا لیا۔ جیسا پہنا دیا پہن لیا مگر تم کو تو چاہیئے
کہ ہر طرح کی نگہداشت رکھو۔ اماں جان تو یہ نصیحتیں فرما رہی تھیں اور مجھکو دل ہی
دل میں ہنسی آ رہی تھی۔ میں یہ سوچتی تھی کہ خیر ان کی تو مامتا ہے اسوجہ سے
ان کو لگتی ہے مگر میری تو دونوں جہان کی فلاح اُسی شخص کی ذات پر منحصر
ہے۔ میرا چین میرا آرام میری عزت صحت۔ خوشی۔ اولاد۔ غرض دنیا کی
ہر ایک نعمت اُس ایک فرد بشر سے وابستہ ہے اگر وہ کہیں تو میں اپنا کلیجہ تک
نکال کے رکھدوں اور پھر ایسا خاوند کہ اگر ساری عمر اُس کے پاؤں دھو دھو کے
پیوں تو عین ثواب اور اگر فقط جوتیاں سیدھی کرنے میں تمام زندگی بسر ہو
تو بھی حق خدمت نہ ادا ہو۔ مگر لطف یہ ہے کہ وہ خود اپنے تئیں یہ سمجھتے ہیں کہ میرا
بڑا فرض اپنی بیوی کی خدمت کرنا ہے۔ اِس لیے اکثر ہماری باتوں سے ظاہر او دنیا
کو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ فقط میاں تو بیوی کا تابعدار ہے مگر بیوی خود مانع
ہے۔ یہ خبر نہیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو خوش رکھنے کی ہر وقت کوشش
کرتے رہتے ہیں۔ اور چونکہ خدا نے قدرتاً عورت کو اقلیم محبت میں حکمراں بنایا ہے
اِس لیے مرد اگر فرض بندگی ادا کرے تو کوئی عیب نہیں لیکن عورت کا اِس
خاص اقلیم میں مرد کا محکوم ہونا ایسا ہی خلاف مصلحت ہے جیسا مرد کا ابنائے دنیوی

کاروبار میں عورت کی تابعداری کرنا خیال جان کا تو یہ کہکر میں نے اطمینان کردیا کہ انشاء اللہ ضرور آپکی نصیحت پر عمل کروں گی مگر اُن کے ساتھ نام کے متعلق جو بحث کرنے کا ارادہ پختہ کرلیا تھا اُسکو نہیں توڑا۔ شام کو جب وہ کچہری سے واپس آئے تو دیکھتی کیا ہوں کہ میاں ننھے کی تیوری پر بل پڑا ہوا ہے میں سمجھ گئی کہ باپ نے کوئی کام خلاف مرضی کیا ہوگا چنانچہ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ جج صاحب کے پاس سے ابھی نہ آتے تھے میں زبردستی لایا ہوں۔ میں نے کہا قیصر پیارے کل پر چلے جانا خفا نہو۔ مگر تیوری کا بل نہ گیا۔ نرس نے ہاتھ منہ دُھلا کر کپڑے بدلے تو ذرا مزاج درست ہوا اور باپ کے پاس آنکر چار پینے کے لیے کرسی پر بیٹھ گئے غرض جب سب فارغ ہو چکے تو میں نے نرس سے کہا کہ دیکھنا ننھے کو نیند آتی معلوم ہوتی ہے وہ آنکر بہلا پھسلا کرلے گئی۔ اب فقط میں اور وہ میز پر رہ گئے میں نے پوچھا کہ آج شام کو تمھیں کچھ زیادہ کام تو نہیں کرنا اگر کرنا ہو تو ابھی سے کہدو تاکہ میں اپنا ارادہ ملتوی کردوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ کام تو بہت ہے مگر آپ اپنا ارادہ ملتوی نہ کیجئے۔ آپکی خدمت میں ہر وقت حاضر ہوں۔ میں بولی کہ خیر طنز کی باتیں تو مجھے بھاتی نہیں مگر ہاں آج ایک معاملہ میں تم سے رائے لینی ہے اِس شرط پر کہ تم یہ اقرار کرو کہ معقول جواب دوگے یہ نہیں کہ جو میں کہوں وہ سب ٹھیک ہی۔ اسپر کہنے لگے کہ اچھا تو تم مجھ سے یہ وعدہ کرو کہ اگر کوئی بات تمھاری مرضی کے خلاف میرے ذہن میں آئے تو اس کے اظہار سے تم ناراض تو نہو گی کیونکہ مجھکو مشکل سے مشکل مقدمے کے لیے اتنی کوشش نہیں کرنی پڑتی جتنی آپ کے منانے کے لیئے۔

میں نے جب اُنکا پورے طور پر اطمینان دلادیا کہ ڈرو نہیں میں ہرگز خفا نہونگی تو اس مضمون کی تمہید اسطرح اٹھائی کہ ناصر دلہن کے خط سے مجھکو

معلوم ہوا کہ وہ اپنے میاں کو نام لے کر پکارتی ہیں۔ خیر اُن کے میاں تو تمہاری طرح آزاد منش ہیں۔ اُنکا بیوی کو نام لے کر خطاب کرنا تو کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ تم تو اُن پر بھی سبقت لے گئے کہ شاعری کی ساری اصطلاحات میرے پر ختم کر دیں مگر عورت کو خاوند کا نام لینا کہاں تک بھلا معلوم ہوتا ہے انہوں نے کہا اصل بات یہ ہے کہ نام تو غیر مادی شے ہے مثلاً تم نے آجتک کبھی میرا نام نہیں لیا۔ اگر سامنے ہوا تو نام کی ضرورت ہی نہیں اور غیبت میں تو "وہ" ہوں ہی۔ مجھکو یہی بھلا معلوم ہوتا ہے اگر تم کچھہ اور کہنا پسند کرو تو وہ بھی امنا و صدقنا۔

غرض تو دلی محبت اور اخلاص باطنی سے ہے نہ کہ ظاہری الفاظ سے لیکن اگر یہ پوچھتی ہو کہ عام طور پر اس کا رواج دینا بھی مناسب ہے یا نہیں تو میری رائے میں چنداں ضرورت نہیں۔ کیونکہ اول تو ہر گھر کے بزرگوں کو یہ طریقہ نہایت غیر مہذب معلوم ہوگا۔ دوسرے کوئی صریح فائدہ متصور نہیں۔ یہ ہر شخص کی اپنی طبیعت پر منحصر ہے۔ اب تم بتاؤ کہ تم نے اس کے متعلق کیا رائے قایم کی ہے۔ میں نے کہا کہ مجھکو تمہارے سے اتفاق ہے۔ لیکن ساتھہ ہی یہ بھی سوچتی ہوں کہ یہ بات رواج پا جائے تو کچھہ حرج بھی نہیں۔ اِس گفتگو کے بعد وہ تو مسجد میں عشا کی نماز کو چلے گئے اور میں باہر چوکی پر وضو کرنے کو بیٹھہ گئی اور یہ قصہ تمام ہوا ✚

نبت الوقت

خان بہادر مولوی خدا بخش خان سی۔ آئی۔ ای۔ کے مفصل حالات جن کی تصویر آج ہدیۂ ناظرین ہے بوجہ عدم گنجایش درج نہو سکے آیندہ رسالہ میں لکھے جائیں گے ✚

کلی کی بے کلی

نسیم نے مجھے آ آ کے گدگدایا ہے — اسی سے میرے لبوں پر تبسم آیا ہے
یہ میری بو کو نہ چھوڑیگی میں سمجھتی ہوں — مرے حجاب کو توڑیگی ۔ میں سمجھتی ہوں
بنے گی ہاتھ ۔ مرے پیرہن کو کھوسیگی — کلید ہو کے یہ قفل دہن کو کھولے گی
اُڑیگا عارضِ طفلی سے رنگِ نادانی — شگفتگی مری ۔ ہو جائے گی پریشانی
نصیب ہو گا نہ خاطر کو جمع پھر ہونا — کھلائیگا کوئی گل میرا منتشر ہونا
جو میں ہنسونگی تو گلچیں مجھے نہ چھوڑیگا — وہ سلسلہ مری حبِ وطن کا توڑیگا
مری رگوں میں نہ دوڑیگا چڑھ کے پھر پانی — نہ کام آئیگی شبنم کی قطرہ افشانی
ہوائے تازہ کو ترسونگی پا سکوں گی کہاں — چمن میں پھر اسے کھانیکو آسکوں گی کہاں
شجر کی شاخ نہ مجھکو نصیب پھر ہو گی — شعاعِ مہر نہ میرے قریب پھر ہو گی
کہاں یہ رات کو تاروں کی چھاؤں میں رہنا — جگر چھدیگا ۔ بنوں گی میں ہار یا گہنا
گلے پڑوں گی میں جسکے وہ مل کے چھوڑیگا — مرے لباس کی رنگت بدل کے چھوڑیگا
یہ آبرو مرے چہرے کی آب ہی تک ہے — بہار حسن کی رنگِ شباب ہی تک ہے
لٹے بہار تو ہو جائے رنگ فق میرا — اُلٹ پلٹ کے ہو برباد ہر ورق میرا
جفائیں سہنے کو شاید جہاں میں آئی ہیں — ہوئی یہ چوک کہ حس اور جان لائی ہیں
مگر دہن نہ میسر ہوا کہ بول سکوں — جگر کی چوٹ کا پردہ زباں سے کھول سکوں
کہے یہ کون کہ اللہ سے ڈراو گلچیں — یہ بے زبان ہے نہ اس پر ستم کراو گلچیں
وہ کیا سنیگا اُسے کوڑیوں کا لالچ ہے — طمع ہے سخت بری چیز شوق یہ سچ ہے

احمد علی شوق ۔ لکھنوی ۔

یادِ اجل

آسودگی بگوشۂ ہستی نہ دیدہ ایم   جان دادہ ایم و کنج مزارے خریدہ ایم

میں اے اجل ہوں تیرا امیدوار کب سے!   تیری مفارقت میں ہوں بے قرار کب سے!
ہے میری جان آجان تجھ پر نثار کب سے!   کرتا ہوں آہ تیرا میں انتظار کب سے
مجبور و مضطرب ہوں بے اختیار ہوں میں
اے مرگ تیری خاطر سینہ فگار ہوں میں

اے پُر ز ناز و نخوت ۔ آن بان والی   اے غم فروشِ عالم ۔ اونچی دکان والی
اے صاحبِ عزت ۔ بزرگ شان والی   شرم و حیا کی دیوی ۔ شاہانہ شان والی
جاں تیرے خیر مقدم کو رک رہی ہے لب پر
دل کب سے تیرا رستہ تکتا ہے اے ستمگر

اے موت بندِ ہستی سے تو چھڑا دے مجھکو   آزاد کر کے اپنا بندہ بنا دے مجھ کو
صہبائے بیخودی کے ساغر پلا دے مجھکو   آ حجرۂ لحد میں چلکر سلا دے مجھ کو
اے قبر ایک مدت سے وصل کا ہے ارماں
آغوشِ دل میں لے لے شفقت پہ تیری قرباں

میں ہوں فقط اکیلا ۔ کچھ مال ہو نہ زر ہو   دو گز کا اک کفن ہو ۔ کچھ اپنی پاس اگر ہو
کھٹکا نہ رہزنوں کا ۔ چوروں کا کچھ نہ ڈر ہو   شادی کی کچھ خبر ہو ۔ غم کا نہ کچھ اثر ہو
وہ دن کب آئینگے جب احباب روتے ہونگے
ہم اپنا منہ لپیٹے بے فکر سوتے ہونگے

غربت کی ہو نہ پروا ۔ دولت کی ہو نہ حاجت   عزت کی ہو نہ خواہش ۔ ذلت سے ہو نہ نفرت

اعدا سے ہو نہ کینہ۔ یاروں کی ہو نہ اُلفت   اولاد کی محبت۔ ماں باپ کی نہ چاہت

محفوظ ہوں غرض ہم اِن ساری آفتوں سے
بے فکر و مطمئن ہوں دنیا کی کلفتوں سے

کپڑا سفید سر سے پا تک تنا ہوا ہو   ڈھیلوں کا ایک تکیہ سر سے مرے لگا ہو
اور خوابہائے غفلت کا سلسلہ بندھا ہو   لیکن نہ وہ پریشان دنیا کے وہم سا ہو

اِس میٹھی نیند میں ہم کچھ ایسے بے خبر ہوں
غل شور سے بھی اپنی نالوں سے بے خطر ہوں

سبزہ کی سبز چادر مرقد پہ اک چڑھی ہو   پھولوں کے بدلے جس پر حسرت برس رہی ہو
سنگِ لحد سے تصویر اک یاس کی کھڑی ہو[1]   جائے چراغ جس پر تاریکی چھا گئی ہو

سر پیٹتی ہو حسرت اور نوحہ خواں ہو ارماں
ماتم کرے تمنا۔ ہو شوق مرثیہ خواں

سنسان مقبرہ ہو۔ ہر سو ہو ہُو کا عالم   اور لہلہا رہا ہو سبزہ کا ایک پرچم
ہر پھول داغ غم ہو۔ ہر نخل نخلِ ماتم   آنسو بہا رہی ہو تربت پہ میری شبنم

تنہائی ہو محافظ تا کی مکاں کی میرے
اور بیکسی ہو درباں اِس آستاں کی میرے

ہم جانتے ہیں لیکن اے موت تیری خصلت   مکار۔ بے حمیت۔ بد چشم۔ بے مروت
تو کب نکلنے دیگی دل کی ہماری حسرت   ہے بے وفائی تیری معمولی ایک عادت

تجھ سے وہاں جو ملتے اُس کے گلے لگے تو
جو دل سے تجھ کو چاہے اُس سے الگ رہے تو

آمد کا اپنی مژدہ سنوائے گی یقینی   اور میری آرزوئیں بر لائے گی یقینی

[1] یورپ میں دستور ہے کہ اکابر اور مشاہیر ملک کی بالین قبر پر بطور یادگار اُنکا بت بنا کر استادہ کرتے ہیں۔

آنے کو یوں تو اک دن تو آئے گی یقینی | تو آج مجھ کو لیکن ترسائے گی یقینی

رہ جاؤں گا میں کرتا اے موت تیری منت
اور تو رہے گی یوں ہی مخمورِ خوابِ راحت

محمد مسلم عظیم آبادی

طفلِ ابر

(پہاڑ کے ایک منظر کو دیکھ کر)

وہ دیکھو! کوہ کے پہلو سے طفلِ ابر اُٹھا! | وہ سامنے۔ ہے جہاں پیٹر یوکلپٹس کا
وہ بھاپ سا۔ وہ دھواں سا۔ وہ ملگجی سا ابر | وہ ننھا منا۔ بگولا سا۔ وہ ذرا سا ابر
وہ پیارا پیارا سا۔ وہ دلربا سا دیکھو تو | نہ دیکھا ہوگا کبھی یہ تماشا دیکھو تو

اہاہا! کھڈ میں سے اور اک غبار سا نکلا | ہوا کے گھوڑے پہ بادل سوار سا نکلا
وہ پھیلا۔ اور وہ سرکا۔ بڑھا چلا کیا خوب | وہ مل کے دونوں نے ٹیلہ چھپا لیا کیا خوب
اندھیرا ہو گیا اب ڈھونڈو کا ربادل سے | نہاں نظر سے ہوئے کھیت سبز مخمل سے

وہ دیودار کے جنگل وہ فرنِ خوش منظر | بنی ہوئی تھی جو سب کوہسار کا زیور
نظر فریب جو تھیں بھول پتیاں ایلو | وہ سب [illegible] بادل کے چھپ گئیں دیکھو
[illegible] چھپا | فراز تو وہ۔ کھڈوں کا جو تھا نشیب چھپا
وہ [illegible] اوجھل ہے | زمین سے تا به [illegible] اب تو صرف بادل ہے

لو بھیگی بھیگی ہوا آئی مینہ برسنے لگا ! لو بوندوں کا سب کہسار پر بندھا سہرا
لو کھڑکیوں سے مہاوٹ کی چلمنیں چھوٹیں لو وہ پہاڑ سے پتھر گرے سلیں ٹوٹیں
لو پانی سانپ کی مانند کوہ سے اترا۔ لو کھڈ کی سمت چلا بے تحاشا لہراتا
اچھلتا۔ کودتا۔ رکتا ہوا چلا آتا سمٹتا۔ پھیلتا۔ جھکتا ہوا چلا آتا۔
بدلتا رنگ کھٹوں میں مچاتا شور گھسا چمکتا۔ گرتا۔ سنبھلتا۔ دکھاتا زور گھسا

نکھر رہے ہیں شجر اور حجر دلہن کی طرح پہاڑ پر ہی بہار آج کل چمن کی طرح
عروج روح کو حاصل ہے لطفِ منظر سے یہ طفل ابر آہی یونہی بڑھ رہے۔ بڑے

(سید علمدار حسین واسطی)

دو عزیز

دو عزیزوں کا آج ماتم ہے دو رفیقوں کی موت کا غم ہے
دونو سرور ریاضِ عہدِ شباب دونو وہ آپ ہی تھے اپنا جواب
دونو نوبادہ ہائے گلشنِ زیست دونو وہ غنچہ ہائے گلشنِ زیست
دونو امیدوارِ عیش و نشاط دونو امیدوارِ لطفِ حیات
دونو ناکام و نامرادِ ازل دونو رنجیدگانِ دستِ اجل
دونو بیمارِ دردِ محرومی دونو آشفتگانِ رنجوری
اک برابر کا قوتِ بازو اک رفیقِ خجستہ و خوشخو
ایک جانباز کارزار جہاں ایک نبرہ سرورِ دوش کی جاں

ایک مردِ جسری و عالی ہمم — اک شکیل و حسین و والا شیم

اک قوی تندرست و الا شان — ایک نازک حلیم جانِ جہاں

اک متین استوار۔ غیرت دار — اک شگفتہ ظریف۔ یار ونکا یار

صادق القول ایک نیکو شعار — اک قیامت کا شوخ او طرّار

ایک بچپن کا ساتھ کھیلا ہوا — ایک ناشاد جسکا چیلا ہوا

دونو پھول اپنی اپنی رنگت کے — دلربا اپنی اپنی صورت کے

دونو جرعہ کشانِ مرگِ شباب — دونو دلدادگانِ مرگِ شباب

دونو گھر بھر کو روتا چھوڑ گئے — دونو دُنیا سے منہ کو موڑ گئے

اک نے دولہن کو نامراد کیا — دشمنوں کے دلوں کو شاد کیا

اک نے مادر کو داغِ دل بخشا — زخم اک غیر مندمل بخشا

بھائیوں کو بلکتا چھوڑ گیا — سب کے اُلفت کا رشتہ توڑ گیا

دلِ ناشاد صبر کر ہے مقام — کس لئے دُنیا میں ہاں یا عیش آرام

اس چمن کو ہرا بھرا دیکھا — ابھی دُنیا کا تو نے کیا دیکھا

ناشاد

مار ڈالا دوستوں کے غم نے اے مختصر ہمیں — چند دن میں ختم ہے اپنا بھی دورِ حیات

گھٹ گیا زورِ جوانی ہو گئے اعضا ضعیف — کون اب سر پر اُٹھائے بارِ احسانِ حیات

خیر سے جیتے جیتے ہو گئے چالیس سال — اب کہاں وہ روز و شب کہئے جنہیں جانِ حیات

کان میں آخر صدائے الرحیل آنے لگی
کچھ نہ ہم سے ہو سکا تھا جو کہ شایانِ حیات

اف رے مستی شباب آلود طغیانِ شوق
خوب کی جی کھول کر سیرِ گلستانِ حیات

ذرّہ ذرّہ دشتِ مقصد تھا یہ لیکن کیا ملا
چھان ڈالی ساری توسیعِ بیابانِ حیات

ہائے وہ دل نذرِ خواہشہائے بیجا کر دیا
صدر میں بکھرے کے جو تھا مرتبہ دانِ حیات

فکر تسخیرِ بتاں اس جذب سے ہوتی رہی
جو کہ تھا شیرازہ بندِ جزوِ ایمانِ حیات

یہ حواسِ ظاہری اور یہ حواسِ باطنی
شکر کے سجدے کرو جبتک ہیں مہمانِ حیات

ڈوبتا ہے نورِ آنکھوں کا برنگِ نجمِ صبح
اب تو آئینہ اٹھا کر دیکھ لو شانِ حیات

ہو رہی ہے یوسفِ بے کارواں منہ میں زباں
گر رہے ہیں دانت جو تھے رکنِ ایوانِ حیات

ہاتھوں کا رعشہ خبر دیتا ہے بڑھکر متصل
چھوٹنے ہی کو ہے کوئی دم میں دامانِ حیات

ضعف سے تھرا کے دونوں پاؤں دیتے ہیں خبر
آگیا نزدیک آخر وقت پایانِ حیات

ایکدن وہ تھا کہ تو پر اپنے خوش ہوتے تھے سب
آج وہ دن ہے کہ سب ہیں مرثیہ خوانِ حیات

عقل رکھتے ہو تو قبل از مرگ مرنا خوب ہے
محشر اس دنیا میں آخر کبتلک ارمانِ حیات

محشر لکھنوی۔

تازہ غزلیں

کیا قیامت ہے کہ چڑھتا ہی نہیں ہے کوئی
ایک دل دے ذرا دے لا کے کہیں سے کوئی

کتنے ٹکڑے ہوئے دل کے یہ خبر کیا لیکن
دے رہا ہے مجھے چن چن کے زمیں سے کوئی

گر پڑا ہاتھ سے آئینہ یہ ہم نے دیکھا
پوچھے اب اُنکے تحیر کو وہ نہیں ہے کوئی

ناز یا قہر یہ میں کہہ نہیں سکتا لیکن
ہے وہاں تیغ بکف چین جبیں سے کوئی

تیری آواز میں ہستی و عدم دونوں ہیں
ہاں سے جیتا ہے تو مرتا ہے نہیں سے کوئی

اِن بلاؤں نے کہاں سے مرا گھر دیکھ لیا
کہ فلک سے کوئی آتی ہے زمیں سے کوئی

حُسن کا زورِ ستم ہے کہ اوسی کے بل پر
ہم کو چھینے لیے جاتا ہے ہمیں سے کوئی

پردہ چشم میں پنہاں نہ ہو غمزہ اون کا
جھانکتا ہے مجھے ہر بار کہیں سے کوئی

عشق کا نام ہی بد ہے کہ بھری محفل میں
رُخ کو پھیرے ہوئے ملتا ہی ہمیں سے کوئی

دیکھ کر زخمِ جگر کھول کے لب بولا وہ
اب مزہ لے مرے حسنِ نمکیں سے کوئی

دردِ پہلو سے کھُلی شوق کسی کی چوری
اُٹھ گیا ہے ابھی کچھ لے کے یہیں سے کوئی

امید سو وہ مفقود۔ ارمان سو وہ معدوم
اے وائے دلِ مرحوم۔ صد وائے دلِ مرحوم

طالب ہوں مگر ناکام۔ سائل ہوں مگر محروم
تقدیر مری تقدیر۔ مقسوم مرا مقسوم

اب دل کی نہ کچھ پوچھو۔ اب دل کا خدا حافظ
مانوس نہ کچھ مایوس۔ مسرور نہ کچھ مغموم

غمخوار یہ کہتے ہیں۔ درمانِ غم آسان ہے
آثار یہ کہتے ہیں۔ خیریتِ جاں معلوم

قربانِ خصوصیت۔ کیا رسم ہے کیا بدعت
الفت ہے سو وہ مشکوک نسبت ہے سو وہ موہوم

بس حدِ خطا کب تک بس شکرِ جفا کب تک
ظاہر ہے کہ تو ظالم ثابت ہے کہ ہم مظلوم

قسمت سے وہ ملزم ہوں شامت سے وہ مجرم ہوں
جو داد سے بھی محروم بیداد سے بھی محروم

آزاد کی میخواری آزاد کا حصہ تھی۔
جب پی تو کہا کر لی۔ الناد رکالمعدوم

تیری نگہ نے گل پیرہن ہستی ہے گلشن پر
بہاریں لوٹتی رہتی ہیں تیرے نیچے دامن پر

سمجھتا ہے ہم آغوشِ سکوں جس جمع خاطر ہو
نظر بیٹھی رہے صیاد کی میرے نشیمن پر

گہے ایمائے لطف، خاص گاہے شانِ یغما کی
قرارِ دل فدا ہے تیری نیرنگئے چتون پر

اسیرانِ قفس سے ذکرِ گلشن کس لیے ہمدم
ہمیں کیا گر بہار آئی ہوا اُنکے اُٹھتے جوبن پر

عنایت جب کرے ساقی وہی ہے وقت مینوشی
نہیں ہے جوشِ مستی منحصر بھادوں پہ ساون پر

بھلا ہم اور تیرے مٹنے سے مٹ ہی جائینگے — ہنسی آتی ہے مجھکو اے فلک اس تیرے بچپن پر

کسیکا وہ زمانہ یاد ہوگا تم کو اے بسمل

بلا کی اٹھکھیلیاں کرتا تھا جب اک رُخِ روشن پر

عمر گذری سر کو ٹکراتے نہیں ٹوٹا قفس — دیکھئے کب طائرِ جاں اُڑکے چھوڑیگا قفس

محوِ قیدِ عشقِ گل بلبل ہے اسکو کیا خبر — تیلیاں تھیں یا رگِ گل پھول تھا یا تھا قفس

عمر بھر بھگتی ہے اسنے حلقۂ گیسو کی قید — طائرِ جاں کو یہی پھندا زلفِ پر خم کا قفس

کس نرالے ڈھنگ سے کرتا ہے بلبل کو اسیر — باغ میں گلچیں بناتا ہے رگِ گل کا قفس

ہجرِ گل میں کرتی ہے بلبل یہ نالے رات دن — میں کہاں گلشن کہاں گلچیں کہاں کیسا قفس

شکوہ صیادِ ستمگر کی جفا کا کیا کروں — تھا ازل ہی سے مری تقدیر کا لکھا قفس

سنبلستاں میں ہے بلبل کا نشیمن آج کل

حلقۂ گیسو ہے اب شل طائرِ دلکا قفس

پھرتے رہے ہوس میں فدائی کہاں کہاں — اور تیغ اوسکی خوں میں نہائی کہاں کہاں

دل تھا خدا کا گھر اُسے گھر اپنا کر لیا — اب آپ تو کروگے خدائی کہاں کہاں

دلکو بچاؤں یا کہ جگر کو پناہ دوں — اُس شعلہ رو نے آگ لگائی کہاں کہاں

دشمن سے ملکے خرمنِ جاں کو جلا دیا — بے مہر تو نے آگ لگائی کہاں کہاں

وہ دلکو تھام لیتے ہیں ہلجاتا ہے فلک — کی میری آہ نے بھی رسائی کہاں کہاں

اُسنے ازل سے تا بہ ابد روپ ہی بھرا — صورت بدل بدلکے دکھائی کہاں کہاں

کعبہ میں بتکدہ میں کلیسا میں اے قضا

اُس نے بھی اپنی شکل دکھائی کہاں کہاں

(منظور علی مخدومی امیوری)

جمی ان میں نہ صرف روالیق دیدہ زیب اور نہایت خوشنما۔ کاغذ اعلیٰ قسم کا چکنا ولایتی تصویریں
نفیس آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی اور سب پر طرہ دو سرورق جو اپنی اپنی جگہ نستعلیق کی چھپائی کے
نادر نمونے ہیں۔ ایک پر سنہری دوہری بیل مع طغرائی شاہی اور دوسرے پر خوشرنگ گوٹے کی
بیل نہایت پسندیدہ ضخامت مع تصاویر تین سو صفحے سے زیادہ۔ الغرض کتاب ہر پہلو سے
ایسی ہے کہ ممکن نہیں جو اس کی خوبیاں دل کو گرویدہ نہ کر لیں باوجود ان خوبیوں کے قیمت صرف
ہے مع محصول ڈاک۔ دفتر مخزن دھلی سے منگائیے +

فہرست مضامین مقام خلافت

فہرست تصاویر مقام خلافت

حیات جاوید

یعنی سوانح عمری سرسید مرحوم بالتصویر مصنفہ مولنا حالی اس کتاب کو ایسی شہرت و مقبولیت حاصل ہو چکی ہے کہ اب مزید تعریف کی ضرورت نہیں۔ مختصر یہ کہ سرسید کے حالات ولادت سے وفات تک نہایت شرح و بسط سے قلمبند کئے گئے ہیں۔ اور دوسرے حصّہ میں سرسید کی تالیفات و تصنیفات اور ان کے کاموں پر نہایت مفصل ریویو کیا گیا ہے۔ مولنا حالی کی کامل دس برس کی مسلسل محنت اور عرق ریزی کا نتیجہ ہے ضخامت (...) صفحوں سے زیادہ ہے قیمت صرف (...)

حیات سعدی

شمس العلما مولنا حالی کی بے نظیر تصنیف جس میں شیخ سعدی شیرازی کے زندگی کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں۔ اور شیخ کی تصنیفات نظم و نثر پر نہایت محققانہ ریویو کیا ہے شیخ سعدی کی کوئی سوانح عمری اس سے بہتر اسوقت موجود نہیں۔ قیمت (عہ)

الفاروق

ضخیم اور مشہور و معروف کتاب مولنا شبلی کی برسوں کی جانکاہی کا نتیجہ ہے حضرت عمر فاروق کی مفصل سوانح عمری جس کے مطالعہ ہی سے سچا جوش اور قومی غیرت پیدا ہو جاتی ہے نیا ایڈیشن قیمت (عہ)

یادگار غالب

مولنا حالی کی تصنیف جس میں انہوں نے حیات سعدی کی طرح اول میرزا غالب مرحوم کے واقعات زندگی تحریر کئے ہیں۔ پھر میرزا غالب کی اردو اور فارسی نظم و نثر کا انتخاب شامل کیا ہے۔ اور ہر ایک صنف کلام پر نہایت خوبی سے ریویو کیا ہے میرزا کی تصویر بھی اس کے ساتھ شامل ہے طبع جدید قیمت صرف۔ (عہ)

دعوت اسلام یعنے ترجمہ پریچنگ آف اسلام مصنفہ پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ۔ مترجمہ منشی محمد عنایت اللہ بی اے۔ تمام ان کتابوں میں جو فی زمانہ تاریخ اسلام پر انگریزی زبان میں لکھی گئی ہیں یہ کتاب سب سے زیادہ قابل قدر ہے۔ اس کتاب کی خوبیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ خاتمہ میں بیان کیا گیا ہے کہ مذہب اسلام کی اشاعت کے اسباب کیا تھے اور پھر اسلامی اعتقادات کی سادگی اور صفائی اسلام کی روشن خیالی و بانیء اسلام پر بحث کی گئی ہے انگریزی میں یہ کتاب اب میسر نہیں۔ صرف اردو میں موجود ہے قیمت (ستے) مل سکتی ہے۔

علم الکلام حصہ اول مرتبہ مولانا شبلی نعمانی جس میں علم کلام کی ابتدا اور اس کے عہد بعہد کی وسعت ترقی اور تغیرات کی نہایت تفصیلی تاریخ اور علم الکلام کے تمام شعبوں کی تقریظ و تنقید ہے قیمت عمر

سفر نامہ سید سر سید احمد خاں نے ۱۸۸۴ء کے آغاز میں مدرسۃ العلوم کی امداد کے لیے پنجاب کا جو سفر کیا تھا اس کے حالات جمع کیے گئے ہیں اور بہت سے لکچر اور تقریریں بھی شامل ہیں قیمت بغرض (دعا)

سفرنامہ ڈاکٹر برنیر ایک فرانسیسی عالم ڈاکٹر برنیر نے ۱۶۵۶ء میں اور اورنگ زیب کے عہد حکومت میں ہندوستان کا سفر کر کے یہ سفر نامہ فرانسیسی زبان میں لکھا تھا جس کا ترجمہ انگریزی میں ہوا۔ اور انگریزی سے اردو میں خلیفہ سید محمد حسین صاحب مرحوم نے مع بہت سے مفید حاشیوں کے ترجمہ کیا۔ دو جلد میں

مسدس حالی یعنے مولانا حالی کی نہایت مشہور اور مقبول نظم جس میں انہوں نے مسلمانوں کی گذشت ترقیوں اور موجودہ تنزل کو نہایت فصاحت اور بلاغت سے بیان کیا ہے طبع جدید مع ضمیمہ زینہ چنگ قیمت ۳

نظم حالی اس میں مولانا حالی کی موجودہ سب نظمیں شامل ہیں۔ قیمت ۹

مناجات بیوہ مولانا حالی کا مشہور قطعہ بند ہے۔ نہایت دردناک اور موثر پیرایہ ہے۔ قیمت ۲

کنیز فاطمہ مصنفہ بی بی عزیز الدین احمد صاحب بی اے کلکٹر اس کی نسبت یہی کہنا کافی ہے کہ بوجہ خوبی کے سول سروس کلاس کا اردو کورس مقرر ہوا ہے۔ نہایت ہی عمدہ ناول ہے قیمت ۱

رسوم دہلی (متعلقہ مسلمانان) از تالیفات مولوی سید احمد صاحب دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ اس کتاب کی خوبی کے لیے اسکے مولف کا نام ہی کافی ضمانت ہے۔ فرہنگ آصفیہ کے مرتب کرنے سے مولوی سید احمد صاحب نے جو احسان اردو زبان پر کیا ہے اسکی کافی داد نہیں دیجاسکتی۔ مولوی صاحب کی معلومات رسوم قدیمہ کے متعلق حیرت انگیز ہیں۔ اس کتاب میں مولوی صاحب نے بچہ کی پیدائش کی معمولات شادی اور میت کی تمام رسومات نہایت شرح اور بسط سے لکھی ہیں عورتوں کی لکھی ہے جو اسقدر پیاری اور دلچسپ ہے کہ کتاب چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور بے اختیار داد منہ سے نکلتی ہے مستورات کے لیے

یہ کتاب نہایت دلچسپی ہے اور اس کا مطالعہ ان کے لیے زیادہ مفید ہے
اور با مطلب ہے قیمت فی جلد ۱۲ علاوہ محصول ڈاک۔

رباعیات اکبر

خان بہادر سید اکبر حسین صاحب جج کے کلام نے
جو شہرت و مقبولیت حاصل کی ہے محتاج توصیف
نہیں۔ مخزن پریس ہی نے حال میں ان کی تمام اخلاقی رباعیات کا مجموعہ
نہایت خوشخط قلم اور خوشنما چھاپ کر شایع کیا ہے۔ ہر صفحہ پر ایک رباعی نہایت
اہتمام سے لکھی گئی ہے۔ اور بہت احتیاط اور صفائی سے چھپی ہے۔
کتاب مجلد ہے اور قیمت صرف ۱۲ علاوہ محصولڈاک ہے

منازل السائرہ

یعنے جناب مولوی عبدالرشد صاحب العبید
دہلوی کی مقبول کتاب جس کی [illegible] طبعیت
چھپتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک گیا تھا اور جس کی دوبارہ اشاعت کے [illegible]
تقاضے آتے رہے۔ اب مخزن پریس میں نہایت خوبی سے [illegible]
دوبارہ چھپی ہے۔ اس کتاب میں سائرہ کی زندگی کے مختلف [illegible]
حالات نہایت دلچسپ اور نصیحت آمیز پیرایے سے بیان کیے گئے ہیں
مولوی صاحب کی مشہور طرز تحریر کا یہ ایک عمدہ نمونہ ہے۔ [illegible]
نہایت اچھے اچھے ریویو لکھے ہیں مستورات [illegible]
رکھ کر یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ اور اس کا مطالعہ [illegible]
دلچسپ اور مفید ثابت ہوگا قیمت [illegible] علاوہ [illegible]
سب سے پیشتر علی [illegible] چھپی ہے۔

مثنویات [illegible]

انتخاب مخزن

مخزن کی گذشتہ نو جلدوں میں سے تمام خوبی سے معضامین نظم و نثر جس میں آ گئے ہیں جن کے پاس مخزن کا فائل نہیں ان سے لئے تو یہ کتاب بہت ضروری ہے مختصراً یہ کہ انتخاب لاجواب چند یگانہ روزگار مشہور اہل قلم شعراء اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے مغربی و مشرقی خیالات کا لب لباب ہے۔ پہلا ایڈیشن جو کوئی دو سال ہوئے شائع کیا گیا تھا اس قدر مقبول ہوا کہ پہلا ایڈیشن ختم ہو کر دوبارہ چھپنے کی بہت سی فرمائشیں آئیں۔ چنانچہ کسی قدر ترمیم کے بعد اب پھر یہ انتخاب بالکل تیار ہے۔ اس انمول کتاب کی قیمت صرف (عہ) ایک روپیہ

درد جانستان

(مصنفہ حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی) اس ناول کے چند باب رسالہ مخزن میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ اب اس ناول کو مکمل کر کے کتاب کی صورت میں علیحدہ چھاپ دیا ہے۔ دلی کی زبان میں دلی کا ایک سچا واقعہ اس قدر دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ پڑھنے کے قابل ہے قیمت صرف ۵ر

گذشتہ جلدیں

مخزن کو جاری ہوئے گو آٹھ برس ہونے کو آئے لیکن ابتدا سے اس وقت تک پرچے ملنے محال ہیں۔ تاہم چند جلدیں متفرق بچ گئی ہیں۔ اگر کوئی صاحب خریدنا چاہیں تو طلب فرمالیں۔ یہ بھی اس وقت غنیمت ہیں قیمت قسم اول عہ قسم دوم عہ مجلد

علاوہ محصول ڈاک

مینیجر مخزن

محسن الملک پیٹنٹ
یہ اس نئی وضع کی ترکی ٹوپی کا نام ہے جو ہم نے ابھی انگلستان کے مشہور
کارخانے کرسٹی سے اپنا خاص آرڈر بھیجکر بنوائی ہیں۔
رنگ نہایت خوشنما اور وضع بہت فیشن ایبل۔ استر تمام ولایتی چمڑے
کا ہے جس سے ٹوپی کبھی خراب ہوگی۔ یہ ٹوپی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ جن
اصحاب نے یہ ٹوپیاں خریدی ہیں وہ بہت پسند کرتے ہیں اور اپنے احباب سے بھی اس
ٹوپی کی سفارش کرتے ہیں۔ آپ ایک ٹوپی منگوا کر دیکھئے اگر آپ کو پسند آئے
تو اپنے دوستوں کے لیے بھی طلب کیجئے ہر رنگ اور ہر ناپ کی موجود ہیں
قیمت مع پھندنا صرف للعہ محصولڈاک علاوہ۔
فرمائشیں آنے کے ساتھ سرکا ناپ ضرور آنا چاہیئے
عبدالرشید برادرز جنرل مرچنٹ انارکلی لاہور

لطافت

ایں وصیت کرد مجنوں در دم آخر مُن
تا تواں دیوانہ شد فرزانہ بودن خوب نیست

نیز عالم میں جتنی حادث چیزیں ہیں وُہ اپنی ہستی یا اپنے وجود کے شروع سے ایک حد یا ایک عمر تک ترقی کرتی جاتی ہیں۔ اور اس کے بعد متنزل ہو کر نابُود ہو جاتی ہیں۔ انتہائے ترقی تک جو اُن کا عروج ہوتا ہے اس کو کون یا (evolution) کہتے ہیں۔

بعض نے کون کی مندرجہ ذیل الفاظ میں تعریف کی ہے :-

"کون نام ہے سالمات مادہ کے انضمام اور حرکت کے انتشار کا جس میں مادہ اپنے غیر معین اور غیر لازب اور متحد النوع حالت سے معین اور لازب اور مختلف النوع حالت کی طرف جاتا ہے اور جس میں حرکت منطوبہ جو مادہ میں رہ جاتی ہے غیر معین اور غیر لازب اور متحد النوع حالت سے معین۔ لازب اور مختلف النوع حالت کی طرف چلتی ہے۔

کون کے ساتھ جب فساد کا لفظ ضم کیا جاتا ہے تو اس سے وُہی حالت مراد ہوتی ہے جو دُوسرے الفاظ میں اختلاطی سے تعبیر پاتی ہے۔

اور عام الفاظ میں اُس سے مراد ہونا اور بگڑنا ہوتا ہے۔

جو پودا زمین سے اُگتا ہے اور نشو و نما پاتا جاتا ہے وُہ بتدریج اپنی مقررہ حد تک پہنچ کر سڑگل کر نابُود بھی ہو جاتا ہے۔ عام الفاظ میں اسے ہونا اور بگڑنا کہتے ہیں اور فلسفی یا طبعی ٹرم میں کون و فساد کہینگے۔

اگر کون و فساد کے اطلاق سے اس ہونے اور بگڑنے کی تاویل کریں تو عام لوگوں کے ذہن ایک وقت محسوس کرینگے لیکن جب صرف ہونا اور بگڑنا سے تعبیر کریں تو ایک معمولی سمجھ کا انسان بھی باَسانی سمجھ جائے گا۔

یہ ہر کوئی جانتا اور روز مرہ کے مشاہدہ میں پاتا ہے کہ دُنیا میں اشیا یا وجود پیدا ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ بڑھتے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انحطاطی دائرہ میں بھی آتے جاتے ہیں۔ ایک طرف سے ایک وجود یا ایک چیز حادث ہوتی ہے اور دُوسری جانب سے اُن میں انحطاط بھی ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ بہت تھوڑے لوگ ہیں جو ان دونوں حالتوں کا خوبصورتی اور شعور سے موازنہ اور مشاہدہ کرتے ہیں۔ بہت سی طبیعتیں ایسی واقعہ ہوتی ہیں کہ

"وُہ ان وقفوں اور اُن تدریجی تغیرات سے برائے نام بھی واقفیت نہیں رکھتیں جو اس عالم میں وقوع پذیر ہورہے ہیں۔ دُنیا کا عام مشاہدہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی مسافر ایک جلدی میں راہ طے کرتا جاتا اور سب شیئوں کو پس پُشت چھوڑتا آتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں ڈارون نے ارتقا کا مسئلہ نکالا ہے۔ عام اس سے کہ یہ مسئلہ بجائے خود کیسی ہی حقیت اور کیفیت رکھتا ہو اس قدر تو کہنا ہی پڑے گا کہ غریب ڈارون نے

ملقت کی رفتار کو دیکھا تو بھی اگر بہت سی طبیعتیں اس نئے یا اس دُھن میں لگجاتیں تو شاید آج تک مسٹر ڈارون کی تھیوری کے نقص بھی ظاہر ہو جاتے اور اس کے ضمن میں اور بھی چند قسم کی باتیں نکلتیں جن کا اضافہ علمی ذخیروں میں ایک قیمتی او مُبارک اضافہ ہوتا۔

جیسے ارتقا اور انحطاط ہمیشہ ہستی یا وجود کے اعتبار سے ہوتا ہے یعنی جس قسم کی ہستی یا وجود ہوتا ہے اسی کے مطابق ارتقا اور انحطاط کی رفتار بھی ہوتی ہے۔ ایسے ہی کون و فساد کی رفتار بھی ہستی اور وجود کے اعتبار سے عمل میں آتی رہتی ہے۔ ہر ہستی اور ہر وجود یا ہر نوع کے کون و فساد میں فرق ہوتا ہے۔ دونوں کی کونی فسادی کیفیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ بیشک نفس کون اور نفسِ فساد میں تو دونوں حالتیں ایک ہی سی ہوتی ہیں۔ لیکن تفصیلات اور تشخیصات میں تضاد ہوتا ہے۔ نوع حیوانی میں کون و فساد کی کچھ اَور کیفیت ہوتی ہے اور نباتاتی یا جمادی حصّوں کا کون و فساد کسی اَور کیفیت سے منکشف ہوتا ہے۔ دُنیا یا موجودات میں تین قسم کے وجود یا تین قسم کی ہستیاں پائی جاتی ہیں۔

(ا) - الطف۔

(ب) - لطیف۔

(ج) کثیف۔

الطف وُہ اشیا ہیں جنکی حقیقت سے ہم محض ناواقف ہیں اور ہماری قوتِ مدرکہ یا قوتِ متفکرہ اُن کی کوئی حد قائم نہیں کر سکتی اور نہ یہ حکم لگا سکتی ہے کہ انکی تبعیض اور تجزیہ یا خرق و التیام کن قوانین کے تابع ہیں۔

لطیف وُہ اشیا ریا وُہ وجود ہیں جنکی لطافت اشیا یا ہستی الطف کے

تابع اور ماتحت ہو اور ان کی بابت یہ حکم لگایا جاسکتا ہے کہ ان کا تجزیہ اور تبعیض اور خرق والتیام ممکن نہیں یا انسانی قوتیں اُن سے اب تک واقف نہیں ہوتی ہیں۔

کثیف وُہ اشیا ہیں جو تجزیہ تبعیض اور خرق والتیام کے قابل ہیں۔ حکیموں کی اِصطلاح میں اس شق کی کیفیت محسوسہ اور عالم شہادت کے نام سے تعبیر پاتی ہے۔

ہم اس سلسلہ میں شق اولیٰ الطف چھوڑ صرف لطافت اور کثافت سے ہی بحث کرتے ہیں۔ یہ بات ہر شخص بادنیٰ غور سمجھ سکتا ہو کہ موجودات میں الطف چھوڑ تین قسم کے وجُود پائے جاتے ہیں۔

۱۔ لطیف
۲۔ کثیف
۳۔ لطیف وکثیف۔

یہ لطافت اور یہ کثافت باعتبار جسم۔ قُویٰ۔ خیالات۔ شعور۔ عقول۔ تمیز اور ضمیر کے مزعوم ہے۔ اور اس کی تقسیم ہر نوع اور ہر نوع کے افراد میں کُلاً وجزواً پائی جاتی ہے۔

ہر نوع میں بمقابلہ دوسری نوع کے اور ہر فرد نوع میں بمقابلہ دُوسری فرد نوع کے اور ہر فرد کے اپنے اجزائے منفردہ میں لطافت اور کثافت کی کیفیت جداگانہ مودعہ ہوتی ہے۔

جو اجسام یا جو چیزیں محض لطیف ہیں اُن کی نسبت دو رائیں ہیں۔ بعضوں کی یہ رائے ہے کہ

باوجود اُن کے محض یا مطلق لطیف ہونے کے بھی اُن میں کیفیت لطافت

اور کثافت پائی جاتی ہے گو ان کی کثافت کسی حد تک عام کثافت سے کم ہی ہو
مگر کثافت ہوتی ضرور ہے۔ آفتاب کی ضیا یا روشنی ایک لطافت ہے لیکن اُس کی
حدت بعضوں کے خیال میں بمقابلہ اس لطافت روشنی کے ایک کثافت رکھتی ہے
بعضوں نے کہا ہے کہ یہ کثافت نہیں بلکہ ایک قسم کی لطیف غلظت ہے۔
بعض کے خیال میں جو جسم یا جو وجود اور جو شئے مطلق لطیف ہو اُس میں
سوائے لطافت کے کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔
اسی طرح کثیف اجسام کی نسبت بھی بحث ہے۔ بعض اُن میں بھی دونوں
کیفیتوں کے قائل ہیں اور بعض صرف کثافت ہی کے مؤید ہیں۔ انہیں اختلافات
کی وجہ سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ
"لطیف اور کثیف کوئی جسم یا کوئی کیفیت ہی نہیں۔ یا لطیف ہے یا کثیف۔
اکثروں کا رجحان اس طرف ہے کہ یہ دونوں کیفیتیں مشترکہ بھی پائی جاتی
ہیں۔ وہ اس بحث میں بہت سی مثالیں دیتے ہیں۔ مثلاً انسان اس میں
حواس باطنیہ یا قوائے باطنیہ لطیف واقع ہوئی ہیں اور حواس ظاہریہ نسبتاً
کثیف ہیں۔ شیشہ باعتبار اپنی شفافیت اور جلا کے لطیف ہے۔ لیکن اسکا
جسم باعتبار جسمیت اور ٹھوس پن کے نسبتاً بمقابلہ اس جلدی لطافت کے
کثیف واقعہ ہوا ہے۔ دُخان اور ہوا لطیف ہیں مگر اِن دونوں کا صدمہ
اور ضرب کثیف ہے۔ پانی لطیف ہے مگر ہائیڈروجن اور آکسیجن میں اس کا منفرد ہونا
بہ جہت اطلاقِ کیفیت تبعیض و تجزیہ اور خرق و التیام کے کیفیتِ کثافت
سے بھی متکیف ہے۔
یہ بحث بھی چھوڑ ہم اس مرحلہ پر آتے ہیں کہ
لطیف اشیاء یا لطیف ہستیوں اور اجسام کا کون و فساد بمقابلہ کثیف

اجسام اور ہستیوں کے عموماً مغائر ہوتا ہے۔ اُن کا ہونا بھی کسی اور کیفیت کے تابع ہوتا ہے اور اُن کا بگڑنا بھی کچھ اَور کیفیت رکھتا ہے۔

گو ہم اسباب کونیہ اور موادِ فسادیہ سے بالاستیعاب واقفیت نہیں رکھتے اور اُن کا بہت سا حصّہ ہمارے اختیارات سے باہر اور بالا ہے۔ لیکن پھر بھی ہم اپنی حد اوراک کے مطابق کچھ نہ کچھ واقفیت رکھتے ضرور ہیں اور روسی اور اکی مواد کے اعتبارات پر ہم نے کون اور فساد کے متعلق کچھ ذخیرہ بھی جمع کیا ہے۔ اجسام لطیفہ کی کیفیت کونیہ لطیف ہوتی ہے اور اس میں قدرت کے کمالات کا بہت کچھ مجموعہ ہوتا ہے اور خصوصیت سے اُس کے بعض اجزا میں لطافتِ خاصہ رکھی جاتی ہے۔ لیکن اجسامِ لطیفہ کا فساد یا بگاڑ بمقابلہ اجسام کثیفہ کے فساد اور بگاڑ کے بہت کچھ ردی اور ذلیل تر ہوتا ہے۔

حیوانی انواع میں سے اِنسان بمقابلہ دیگر حیوانات کے اکثر ظاہری اور باطنی اجزا میں لطیف یا لطیف تر واقعہ ہوا ہے۔ اس کے ظاہری اجزا اور ترکیبے بھی لطیف ہیں اور باطنی قوتوں میں بھی اعلیٰ اور نفیس ہیں۔ باطنی کمالات جو اِنسان کے حصّہ میں آئے ہیں دُوسرے حیوانات کی قسمت میں اُنکا عشرِ عشیر بھی نہیں۔

انسان کی کیفیاتِ کونیہ گو دیگر حیوانات کی کیفیات کونیہ سے بعض امور میں متساوی ہیں۔ لیکن بعض میں بالکل نرالی واقع ہوئی ہیں۔ گو اُن میں باعتبارِ اصُولِ خلقت کے مقارنت ہو لیکن قوتوں اور خواص کے اِعتبار سے کلی مشارکت نہیں تعقل و فراست کی قوت جو انسان میں ہے وُہ دیگر حیوانات میں نہیں ہے یا بہت ہی کم ہے۔ تمیز ہر ایک فرد حیوانیہ میں پائی جاتی ہے لیکن انسان میں اس کی مقدار کہیں زیادہ ہے۔

خلاف اس کے جب کبھی کیفیت انسانیہ میں بگاڑ یا فساد واقعہ ہوتا ہے تو بمقابلہ اجسام لطیفہ یا اشیائے کثیفہ کے سخت تر اور ذلیل تر ہوتا ہے جس سے یہ اصول وضع کرنا پڑتا ہے کہ

"جب کبھی لطیف اجسام میں بگاڑ ہوتا اور کیفیت فسادیہ ناشی ہوتی ہے تو بادی النظر میں اس کی عفونت ذلت اور آفت، مواد کثیفہ سے بڑھ جاتی ہے۔

جب انسان مرتا ہے تو اس کی جسمی کیفیتیں ایسی بری طرح فاسد ہوتی ہیں کہ ایک بھیڑ بکری یا کسی دیگر حیوان کی مردہ کیفیات سے کچھ نہ کچھ زیادہ متعفن ثابت ہوتی ہیں۔ ہر حیوان کے مردہ ڈھانچے سے دنیا میں کچھ نہ کچھ کام لیا جا سکتا ہے اور ہر کثیف ہستی فساد کے بعد بھی کام دے جاتی ہے لیکن جسم انسان فساد کے بعد بالکل ترک کر دیا جاتا ہے۔

انسانی لاش کا تعفن بمقابلہ دیگر حیوانی لاشوں کے ہمیشہ زیادہ ہوتا ہے۔ انسانی لاشیں اور انسانی مردے بہت جلد سڑ گل جاتے ہیں۔ لیکن ویسے حیوانات کی لاشیں اور ڈھانچ ذرا دیر سے متعفن ہوتے ہیں۔

انسان کے جسمانی زخم خود بخود بہت کم اچھے ہوتے ہیں لیکن دیگر حیوانات کے زخم قدرتی طور پر خود بخود ہی صاف ہو جاتے ہیں۔ آنکھ بہ نسبت ناک اور کان کے ایک لطیف جسم یا لطیف پرزہ ہے اور ناک اور کان بمقابلہ ہاتھ کے اور ہاتھ بمقابلہ پاؤں کے تجربہ اور مشاہدہ ثابت کرتا ہے کہ

آفت رسیدہ آنکھ بہ نسبت آفت رسیدہ ناک و کان اور آفت رسیدہ ناک و کان بمقابلہ ہاتھ کے اور ہاتھ بمقابلہ پاؤں کے نسبتاً علی الترتیب زیادہ

اور کم ناؤف ہوتے ہیں۔ آنکھ کے واسطے ایک معمولی صدمہ بھی بمقابلہ
پانوں کے ایک بڑے صدمہ کے بڑا ہے۔ قوت سامعہ کا مختل ہونا بمقابلہ
اختلال قوتِ باصرہ کے کسی قدر کم مصیبت کا موجب ہے۔ قوتِ حافظہ کا
اختلال بمقابلہ اختلال قوتِ متفکرہ کے زیادہ وزن کی تکلیف ہے۔

مقطر اور صاف پانی میں اجزائے کثیفہ کا مل جانا بمقابلہ کثیف پانی
میں ملنے کے زیادہ تر تکلیف دہ ہے۔ راکھ مٹی میں ملنے سے بمقابلہ شعلہ
آگ کے انطفاء یا بجھنے کے کم کثافت رکھتی ہے۔

شیشہ پر گرد پڑجانا بہ نسبت ایک پتھر یا ایک لکڑی پر گرد پڑجانے کے
زیادہ تر ظلمت اور کثافت کا موجب ہے۔

تلوار اور درانتی کی دھار کی شکستگی اور کندی میں فرق ہے۔ سفید اور
سیاہ رنگت پر دھبے پڑنا بہت کچھ فرق رکھتا ہے۔ آفتاب پر بادل آنا
اور محض خلائے آسمان پر ابر کا ہونا دو جداگانہ کیفیتیں ہیں۔

دھوپ پر سایہ ہونا اور سایہ پر کسی اور سایہ کا آنا دو علیحدہ علیحدہ
حالتیں ہیں۔

نور میں ظلمت اور ظلمت میں ظلمت دو ایسی متضاد کیفیتیں ہیں کہ جن سے
لطافت کی لطافت اور کثافت کی کثافت کا وزن اور طاقت کا علم خوش
اسلوبی ہوسکتا ہے۔

چونکہ عورت بمقابلہ مرد کے نزاکت۔ نفاست اور لطافت میں نسبتاً
اعلیٰ اور انفس والطف بنائی گئی ہے۔ اس واسطے عورت کی حفاظت زیادہ
ہوتی ہے اور جب وُہ باعتبار خیالات۔ احترام۔ اعزاز اور عصمت اور جانی
حالتوں کے بگڑتی ہے تو بہت زیادہ اور ذلت سے بگڑتی ہے سب کے سب مرد

باعث نہیں ہوتے لیکن اُن کے مقابلہ میں بھی جب کوئی عورت عصمت کے اعتبار سے ملزم ہوتی ہے تو اُس کی بے عصمتی کا شہرہ گلی گلی اور محفل محفل ہوجاتا ہے اور اس کا اثر پشتوں واغ ازلی کی طرح نہیں مٹتا۔ عوام الناس جب کوئی قصور اور گناہ کرتے یا کسی لغزش کے مرتکب ہوتے ہیں تو گھنٹہ دو گھنٹہ ذکر اذکار رہ کر بات ختم ہوجاتی ہے۔ لیکن جب کوئی خاص آدمی مرتکب ہو تو سالوں نشانہ بنا رہتا ہے۔ سیاہ کپڑے پر دھبہ نظر نہیں آتا اور نہ اُس کی خوبصورتی میں چنداں فرق لاتا ہے لیکن سفید کپڑے کا داغ سفیدی پر ایک بدنما داغ ہوتا ہے۔

موتی ٹوٹ کر کچھ نہیں رہتا پتھر کے ٹکڑے سڑک کے کام آتے ہیں۔ ظرف چینی میں جب بال آتا ہے تو جڑتا نہیں اور بدنما ہوجاتا ہے۔ معمولی مٹی کے ظرف شکستہ ہونے پر بھی کام دیتے اور خوشنما خیال کئے جاتے ہیں۔

ایک غلام صد ہا جھڑکیاں دن بھر میں کھا کر بھی ہنستا ہی رہتا ہے اور اُس کا ملال و رنج دم بھر میں دُور ہوجاتا ہے لیکن ایک محترم شخص کے واسطے ایک اشارہ بھی دونوں کی کلفت کا باعث ہوتا ہے۔ گدھا چابکوں سے بھی نہیں چلتا اور گھوڑا اشاروں پر کام دیتا ہے۔ اس قسم کی تمام مثالوں سے ظاہر ہے کہ

۱۔ کیفیات لطیفہ بمقابلہ کیفیات کثیفہ کے زیادہ تر ذکی الحس ہیں۔

۲۔ اور زیادہ تر ماؤف ہوتی ہیں

۳۔ اور زیادہ تر کیفیت فساد قبول کرتی ہیں۔

یہ قیاس بطور ایک کلیہ یا قاعدہ کے ہوتا جاتا ہے وسعت نظر ہمیں آسانی سے یقین دلاتی اور اعتراف کراتی ہے اور موجودات کے تمام تعلق یا

"...سا ہی ہو رہا ہے۔
اس سے یہ بحث چھڑتی ہے کہ
" ایسا کیوں ہوتا ہے۔
"اور اخلاقاً انسانی زندگیوں کے مقابلہ میں اس کا اثر اور نتیجہ کیا ہے۔
"اور اس سے کیا سبق ملتا ہے۔

اجسامِ لطیفہ کا فساد اس واسطے زیادہ تر مکروہ فساد ہوتا ہے کہ اُنکا ہونا یا اُن کا کون اپنی ذات میں ایسی لطافت رکھتا ہے کہ جب کبھی اس میں فساد واقع ہوتا ہے تو اس لطافت کے تمام اجزائے لطیفہ اس طرح بکھرتے ہیں اور اسبابِ فسادیہ بوجہ لطافت اس شدت سے اُن میں سرایت اور نفوذ کرتے ہیں کہ بمقابلہ اجسامِ کثیفہ کے اُن کا تعفن اُنکا بگاڑ اور اُن کا تخلخل نمایاں ہوتا ہے۔ اسبابِ فساد میں بالذّات کثافت ہوتی ہے اور وُہ بالذّات اجسامِ لطافت کے مغائر ہوتے ہیں۔ جب اُن پر اُن کی زد پڑتی ہے تو کثیفات لطیفہ میں اس قدر آفت برپا ہوتی ہے کہ کوئی جزو لطیفہ سبب کثیفہ کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں سکتا۔ اجسامِ کثیفہ میں جب فساد واقعہ ہوتا ہے تو بوجہ اشتراکِ کیفیت کے چنداں تغیر نہیں ہوتا۔ ظلمت میں ظلمت اور سایہ پر سایہ گو ایک نزول ثانی ہے لیکن بوجہ تجانس اثر تبلغ نہیں ظاہر ہوتا۔ اخلاقاً اس کا اثر انسانی زندگیوں کے مقابلہ میں ایسا قیمتی اور گراں قدر ہے کہ ہر سمجھ دار متنفس کا فرض ہے کہ اپنی زندگی کے اکثر حصوں میں اس پر غور کرتا رہے۔

(الف) انسان کی ذات میں قدرت نے دو قسم کا مواد رکھا ہے۔
" ظاہری۔

" باطنی ".

ظاہری مواد صرف جسمانی حالت میں ہی ممد اثر رہ کر ختم ہو جاتا ہے۔ جسم کا خاتمہ اُن سب کا خاتمہ ہے۔

باطنی مواد جسم سے آزاد ہو کر مرکزِ روحانیہ پر جا پہنچتا ہے اور اس کی تکمیل وہاں جا کر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان باوجود اشرف المخلوق ہونے کے جسمانی نگت میں فساد کے بعد کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ بالکل متروک ہو جاتا ہے۔ نہ کام آتا ہے اور نہ کوئی کام میں لا سکتا ہے۔ چونکہ اصل انسانیت باطنی مواد سے وابستہ تھی اِس واسطے وہی مقدم رکھی گئی۔ جسمانیات پر کوئی اِنحصار نہ رہا۔ اِن حالات میں انسان کا فرض ہے کہ وہ لذاتِ جسمانیہ سے اسی قدر کام لے جو محض زندگی کے لئے ضروری ہوں کیونکہ جسمانی طلسم ٹوٹنے کے بعد سوائے عفونت کے اور کوئی صورت نہیں پیدا کر سکیگا۔ بڑی غرض انسانی زندگی کی باطنی مواد ہے اور اس کی ترقی انسانی ترقی ہے۔

(ب) ہم لطیف ہیں اور یہ ہم روز کے مشاہدات میں دیکھتے اور پاتے ہیں کہ لطیف اشیاء میں جب کبھی فساد واقع ہوتا ہے تو سخت بُری طرح ہوتا ہے اِن حالات میں لطیف کا فرض ہے کہ وہ اسباب فساد سے بچنے اور محفوظ رہنے کی زیادہ تر کوشش کریں اور اس بات کی ٹوہ میں لگے رہیں کہ اسبابِ فساد کا نشوونما کن کن اسباب کے تابع ہے اور اُن سے محفوظ رہنے کا کیا طریقہ ہے۔

(ج) جتنے جسمانی طریق اور جسمانی کیفیات ہیں وہ سب فاسد ہونے پر محتمل الکثافت ہیں۔ روحانی طریق اس کثافت کے منزہ ہے۔ ہم اگر ایک گندی آلائش میں آلودہ ہوں تو اس سے ہماری قوتِ باطنیہ میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ایک گندے خیال سے قوتِ ضمیر کی روشنضمیری میں حقیقتاً کوئی کمی نہیں آتی۔ صرف

ایک حجاب حائل ہوجاتا ہے اسی طرح جسمانی کثافتیں روحانی لطافتوں کا استقبال نہیں کرسکتیں۔ ہاں اُن پر حجاب پڑ سکتا ہے۔

جسمانی فساد کے بعد روحانی لطافت اور روحانی کیفیتیں اپنے اپنے محور پر قائم رہتی ہیں اور جسمانی زندگی کی حالت میں رُوحانی کیفیات سے مانوس رہنا ایک تعلق اور رشتہ پیدا ہونے کی وجہ سے رُوحانی سلسلوں میں فرق نہیں آتا۔ لیکن اگر رُوحانی طاقتوں اور باطنی قوتوں سے ہم بالکل ہی دُور رہیں تو اُن کا فساد سخت آفت لاتا ہے۔

(د) ہم میں جو کثافت پائی جاتی ہے وُہ صرف اس واسطے ہے تاکہ کثافتوں کا مقابلہ کرسکیں اور کثافت کثافت کے مقابلہ میں آئے لطافت محفوظ رہے لطافت کثافت کا مقابلہ کرتی ہے لیکن لطیف ڈھنگ اور لطیف صُورت میں قدرت نے لطافت کی عظمت اور نفاست کی وجہ سے کثافت کے مقابلہ کے لئے اجزائے کثیفہ کا ہی تہیہ کر رکھا ہے۔ ثقیل اغذیہ کے ہضم کرنے کے لئے معدہ کی ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔ گُردوں کو تکلیف نہیں دی گئی ہے ناک اور کان سے اُس نُور کی کفالت نہیں لیجا سکتی جو آنکھ سے لی گئی ہے۔ کان جو کام دیتا ہے وُہ ناک نہیں دے سکتی۔

رحم ایک لطافت ہے اور غصہ ایک کثافت رحم یا رحمدلی مظالم کا مقابلہ نہیں کرسکتی لیکن غصہ اس کے مقابلہ میں آسکتا ہے۔ کثافت دراصل لطافت کی کفالت اور ضمانت واقع ہوئی ہے۔ جب لطافت اپنے وقت مقررہ کے بعد جُدا ہونے لگتی ہے تو کثافت کثافت میں مل کر نابود ہوجاتی ہے۔ فرزانگی ایک لطافت ہے اور دیوانگی کثافت دیوانگی میں صدہا نشیب و فراز اور کدورتوں کا تحمل کیا جاسکتا ہے لیکن فرزانگی بحالت فرزانگی متحمل نہیں ہوسکتی جیسے کہ لطافت کثافت کی تحمل نہیں ہوتی ۵ بہیں بہ جسم ضعیفم کہ ہیچ موسیقار۔ خیالها

دیور بھاوجوں کی خط وکتابت

جو چچازاد بہن بھائی بھی ہیں

میرے نہایت عزیز صغیر! یوں تو کئی دن سے ارادہ کر رہی تھی کہ تمہاری سسرال جاؤں اور صغیر دلہن سے ملوں مگر کل محض اتفاق سے وہ ارادہ پورا ہوگیا اور سچ یہ ہے کہ وہ ملاقات ہی اس لکھنے کا باعث ہے۔

یہ تو تم سن چکے ہوگے کہ ہماری خوش قسمتی سے آج کل لیڈی میں ہمارے شفیق افروز ہیں، لیڈی صاحبہ کو جو انس و محبت ہندوستانی عورتوں سے ہے اس کا شکریہ میں کیا کوئی بھی ادا نہیں کرسکتا۔ خاتون موصوف مغربی تعلیم و تربیت کا وہ نمونہ ہے جس میں طرز معاشرت کے اثر نے خلوص و ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھردی ہے۔ میں بحیثیت کلب کی پریسیڈنٹ ہونے کے اپنا فرض سمجھتی تھی کہ اس معزز مگر منکسر بیگم کو شہر کی معقول خواتین سے انٹروڈیوس کراؤں اور ایک شاندار پارٹی میں سب کو مدعو کر کے یہ دکھا دوں کہ مشرقی عورتیں بھی تہذیب و انسانیت سے آشنا ہیں۔ وہ بھی پہلو میں دل رکھتی ہیں۔ ان کے دلوں میں بھی جذبات فطرتی موجود ہیں۔ پردے نے زندگی کو ایک راز بنا دیا ہے اور اس راز میں جو بدنما دھبے بیرونی سطح پر نظر آرہے ہیں وہ محض پردے پر زور دینے والوں کی عنایت ہے۔ اس سلسلہ میں میں صغیرو دلہن سے ملنے گئی۔ لیکن ان کی گفتگو سنکر مجھے تعجب ہی نہیں سخت افسوس ہوا چونکہ تمہاری اجازت نہ تھی اس لئے انہوں نے انکار کیا اور میں اپنا سا منہ لیکر چلی آئی۔

آج میں اس مسئلہ پر تم سے بحث کرتی ہوں، میری رائے میں تم نے خاوند ہو کر یہ نہایت ناجائز فائدہ اٹھایا کہ اپنی بیوی کے ہر قول و فعل یہاں تک کہ ہلنا جلنا آنا جانا غرض ہر چیز کو اپنی رضامندی پر منحصر کیا۔ کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ تم کو خاوند ہونے کی حیثیت سے اس قسم کی حکومت کا کیا حق حاصل ہے۔ تم جانتے ہو عورت کیا شے ہے؟ بیوی کے کیا معنے ہیں؟ اور ایک عورت کے نکاح میں آکر تم پر کیا حقوق واجب ہو گئے؟

تم مجھے معاف کرنا اگر میں یہ کہوں کہ عورت کے وضع کرنے میں فطرت کا جو منشا تھا وہ تمہارے ہاتھوں پورا نہ ہوا اور تم جیسے خود غرض بندۂ نفس مردوں کے قبضہ میں آ کر عورت کی وقعت و عزت سب خاک میں مل گئی۔ تم لوگوں نے بدظنی کے تیروں سے عورت کا کلیجہ چھلنی کر دیا۔ حکومت چونکہ تمہاری گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اس لئے جب وہ باقی نہ رہی تو تم نے بیویوں پر حکومت کرنی شروع کی نیچر نے تم کو صرف تحصیلِ معاش کے واسطے قویٰ زبردست دیئے تھے۔ لیکن تم نے اِن سے اُس مخلوق پر بھی حکومت کرنی شروع کی جو اکثر اعتبار سے تمہارے برابر اور بعض معاملات میں تم سے بدرجہا بہتر تھی۔

پردہ محض تمہاری بدگمانی کا ایک ادنیٰ ثبوت ہے تم نے صرف اس خیال سے کہ انکو دُنیا کی ہوا نہ لگے ان کی آنکھیں چار نہ ہوں کچھ اس طرح قید کیا کہ سب کی سب تمہارا ہی کلمہ پڑھنے لگیں۔

تاریخ تمہارے سامنے ہے دیکھو اور بتاؤ کوئی ملک کوئی فرقہ کوئی قوم عورت پر ایسا جبر کر کے ترقی کر سکی دُور کیوں جاؤ خود اسلام کو لو جس پر اتنا پھول رہے ہو آج بھی اسلامی ممالک میں شرعی پردہ رائج ہے۔ عورتیں آزادانہ پھرتی چلتی ملتی جلتی ہیں وہ مردوں کی دست نگر ہوں محکوم نہیں انکی بیوفائی کی شکایت ہوں کر

مظلوم نہیں۔

تم کو اس سے نہ انکار ہونا چاہیئے نہ ہوگا کہ عورت کا وجود محض مرد کی زندگی کو پرلطف بنا دینے کے واسطے ہے۔ جس وقت دماغ دن بھر کے افکار سے پژمردہ و پریشان ہوتا ہے اُسوقت ایک اُس کی ہنسی وُہ ہنسی جس میں بہت سے راز پنہاں ہیں۔ اس کی مُسکراہٹ وُہ مُسکراہٹ جس کے ساتھ نگاہ کی شوخی اور شرارت شامل ہو تمام آلام کو زائل کر دیتی ہے وُہ اپنی کلفتوں کو بھول جاتا ہے۔ شاعری موسیقی غرض وُہ مادّہ جو قدرت نے عورت کی سرشت میں ودیعت کر دیا ہے تھپک تھپک کے مرد کے رنجیدہ تخیلات کو علیحدہ کر کے دماغ میں مسرت و شوق کی نہ بچھا دیتا ہے۔

عورت ایک پھول ہے جو مرد کے چمنستانِ حیات کو اپنی خوشبو سے مہکا دیتی ہے۔ گو مردوں کی بدولت اس کے اصلی جوہر کھلنے نہ پائے اور یہ منہ بند کلیاں شگفتہ ہونے سے پہلے ہی مرجھا گئیں۔ لیکن پھر بھی اس پھول کی بھینی بھینی خوشبو نے انکی عمروں کو مُعطّر کر دیا۔ اے کاش اِن کلیوں کی قدر ہوتی انکو پانی ملتا۔ قدردانی کے ہاتھ انکو سینچتے تو یہ ناقص العقل فرقہ اتنا ہو سکتا کہ رستہ چلتے درود پڑھتے اور تم لوگ دیکھتے کہ دُنیا میں زندگی کس طرح بسر کرتے ہیں۔

صغیر میاں! بُرا نہ ماننا تم نے اِن پھولوں کو پاؤں سے روندا۔ یہ پنکھڑیاں اس قابل نہ تھیں کہ تم انکو مسل کر پھینکدو۔ عورت وُہ چیز تھی کہ اگر تم اس کی قدر کرتے تو یہ تم کو معراجِ کمال پر پہنچاتی۔ تم کندن نہیں لالوں کے لال ہوتے۔

آخر تم مجھے بتاؤ تو سہی عورت پر حکمران ہونے کا خبط تمہارے دل میں سمایا کہاں سے۔ میں بھی تو سنوں تمہارے پاس ایسے کیا حقوق ہیں جو تم ان بے زبانوں پر سلطنت کرو۔ میں سچ کہتی ہوں تم نے اپنے پاؤں میں آپ کلہاڑی ماری۔ یہ

صرف عورت ہی پر حکومت کرنے کا نتیجہ ہے کہ اصلی حکومت کھو بیٹھے۔ اس جنون نے فقیر بنوا دیا۔ بھیک منگوا دی۔ جو محلوں کے رہنے والے تھے انکو جھونپڑا نصیب نہیں اور جن کے لباس قاقم و سنجاف تھے آج پیوند لگائے پھر رہے ہیں۔

وہ شخص جسکو تم پیغمبر اسلام یقین کرتے ہو جسکو سچا نبی اور پاک رسول مانتے ہو اس کے اقوال پر نظر ڈالو تم کو معلوم ہو جائیگا کہ عورت کی وقعت رسالتمآب کی نگاہ میں کتنی تھی۔ کیا تم تک یہ الفاظ نہیں پہنچے کہ عورت اور خوشبو دو چیزیں مجھ کو دنیا میں زیادہ محبوب ہیں۔ صغیرا! مجھے یہ کہنے کی اجازت دو کہ مسلمان جب تک اپنی عورتوں کی قدر کرتے رہے انکا سکہ تمام دنیا میں بیٹھا رہا لیکن جس روز سے انہوں نے اس قابلِ قدر فرقے کو ذلیل کیا ان کی ہوا اکھڑ گئی غضب خدا کا قرآن صاف الفاظ میں کہے کہ کثرتِ ازواج میں عدلِ حقیقی تم سے ممکن نہیں اور مسلمان نکاحِ ثانی کو سنتِ رسول سے تعبیر کریں۔

ایک خالق کی مخلوق ایک خدا کے بندے ایک دنیا کے رہنے والے ہمارے فرائض الگ تمہارے فرائض الگ۔ تم کو ہم پر حکومت کرنے کا حق کیا؟ تم ہمارے حقوق سے لاپرواہ ہوئے۔ جانوروں کی طرح ہم کو قید رکھا اُسکا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہم جانور تھے ہم نے جانور جنے جانور پلے اور اگر آج تمہیں جانور کہیں تو کیا گناہ۔

آخر مغربی عورتیں بھی تو بیویاں ہیں۔ انکے ہاں بھی خاوند ہوتے ہیں دیکھو وہ ملک کیسی ترقی کر رہا ہے۔ تہذیب کا مرکز شائستگی کا گھر۔ ہم نے بہت روز تک تمہاری اطاعت کی۔ اب وہ دن ہوا ہوئے کہ ہم گھٹ گھٹ کر مریں۔ تمہاری جلیبیں بھریں تمہارے پاؤں دبائیں۔ کہیں جائیں تو تم سے پوچھکر۔ کسی سے ملیں تو اجازت لیکر۔ کھائیں تو صلاح سے پئیں تو مشورے سے۔

نشن ہماری نشست برخاست حرکات سکنات سب تمہاری مرضی کے تابع ہوں۔

پیارے صغیر! صغیر دلہن کا یہ جواب کہ "میں ایسی جگہ بغیر ان کی اجازت کو نہیں جا سکتی" نہایت نامعقول تھا۔ بیوی کو چار دیواری کے پنجرے میں قید نہ کرو اس کو دکھاؤ کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ گو تمہاری صحبت نے اس کی طبیعت متوحش کر دی لیکن وہ قدرت سے ایسا مادہ لیکر آئی ہے جو صرف تھوڑی سی پرداخت کا محتاج ہے دنیا دیکھنے دو۔ زمانہ طبیعت کو آپ ہی درست کر دے گا۔ علم سے فیض ہونے دو۔ سوسائٹی میں شریک کرو۔ پھر دیکھنا کہ یہ پردے کے بیٹھنے والیاں جن پر ہر طرف سے لعن طعن ہو رہی ہے۔ بڑے بڑے حکما کے کان کترینگی۔

مجھے اندیشہ ہے میری تحریر تم کو ناگوار نہ گذرے اب میں ختم کرتی ہوں مگر اتنا اور کہتی ہوں۔ میری اس بات کو یاد رکھنا۔ اگر دنیا میں کچھ کرنا ہے تو عورتوں کے حقوق واپس دو اور وہ کام کرو کہ آنے والی نسلیں دعا سے یاد رکھیں۔

جواب عجوبہ بہن: خط تھا یا برسوں کا بخار جو حرف تھا وہ چنگاری اور جو لفظ تھا وہ شرارہ۔ لیڈی لیسن آئیں تو تمہیں بھاگ اور ٹی پارٹی دی تو تمہاری ہیلیوں کو مبارک۔ بھلا ہم بیچارے غریب سوکھے ٹکڑے تو نصیب ہوتے نہیں۔ پلاؤ قورمے کھائیں تو کس منہ سے۔ تم نے لیڈی صاحبہ کی دعوت کی خوب کیا۔ صغیر دلہن شریک نہ ہوئیں۔ بہت خوب کیا۔ تم تو ماشاء اللہ چھڑی چھانٹ جو کچھ کرتیں کم۔ وہ غریب آدھے درجن بچوں کی ماں۔ ایک گود میں۔ ایک پیٹ میں۔ اٹھنا مشکل بیٹھنا دوبھر ہنسی اڑوانی ہوتی تو جاتی۔ تمہیں بچوں سے نفرت وہ بچوں پہ چھڑکے جان۔ تمہارا اسکا میل کیا تم اللہ رکھے تحصیلدار کی بیٹی ضلعدار کی بیوی جو کرو سب زیب۔ وہ بیچاری ملانی مسجد کے ٹکڑوں سے پلی۔ زکوٰۃ میں بڑھی۔ بیاہی آئی تو یہ بیچھے پڑے کہ بیس روپیہ اور نوبند سے اس کے بھائی کو ب

کلب ٹوٹے تو رہے تو اُسے سب یکساں۔ تم ہی سوچو سچ ہے یا جھوٹ اسکو تو پہلی پڑنی
مشکل ہوتی ہوگی۔ گاڑی کے آٹھ آنے تو بچوں پر دو فاقے ڈالدیتے اور اگر محض شرما
شرمی کھیرا چیکی جاتی بی تو کیا گیارہ مہینہ کا بچہ نئے لوگ اوپری گھر بیسیوں بوائیں
اسے تو کلب جیلخانہ ہوجاتا۔ ماں غریب کلب دیکھتی بچہ بہاتا تی نصیر مہینہ بھر دودھ
چھٹا ماں کے بغیر تو ٹسکنے سے رہا۔ دو قدم آگے ہی ہوتا وہ ایک ضدتی اس سرے
سے ہولوٹ لگاتا تو اللہ جانے فرش میں لپٹا ہوا اس کنارے پہنچتا۔ لوبتاؤ تم ہی
بتاؤ اسکو سنبھالتی اسکو چمکارتی کلب دیکھتی۔ بیویوں سے ملتی! بہن یہ تو پیٹ بھرے
کے سودے اور چھڑی چھٹانکوں کے ڈھکوسلے ہیں۔ خدا شاہد عجوبہ میں تمہاری
کوششوں کا مخالف نہیں تم نے جو کچھ کیا اچھا کیا اور خوب کیا اور کرنا چاہئے تھا۔
مگر ہر کام کا ڈھنگ اور ہر بات کا موقعہ ممبری کی متوقع ہو تو اُن سے جو ارادہ کریں
اور کرسکیں یہ نہیں کہ کیا اور کرنہ جانا۔ میں ہوتی تو کردکھاتی۔ نہیں خدا کی قسم اب کے
جلسہ میں ذرا یہ تو دیکھنا کہ لکچر بیچیں دینے والیاں کے بچوں کی مائیں ہیں بلی
کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا! اگر ایک آدھ نکل بھی آئی تو پھر نوکر گنتا خدمتگار گنتا۔ جن
بیچاریوں کی اپنی ہی پوری نہیں پڑتی وہ نوکر رکھیں تو کس برتے پر! گھر کی جھاڑ
بہارو میاں کا آگا تاگا چولہے کی ہنڈیا ڈوئی کیا کریں کیا نہ کریں۔ بچے پالیں کلب
پہنچیں۔ خفا نہ ہونا۔ میں معترض نہیں۔ ایک فرقے کی طرف سے مجبوری کا اظہار
کرتا ہوں۔ مغربی خواتین کی مثال نہ لو بڑے آدمی بڑے لوگ کا راجہ تیلی کجا نتوا انکو
انہیں روپیہ کی کیا کمی۔ ملک انکا حکومت انکی عزت انکی۔ دولت انکی جو چاہیں کریں
جہاں چاہیں پھریں۔ یہاں نہ گھڑے آگ نہ چولہے پانی۔ پیٹ میں پڑتی ہو تو سب
سوجھتی ہے۔ جن بیویوں پر منہ آ ہی ہو یہ بھی تمہارے ہی جیسی عورتیں ہیں تمہاری
جتنی عقل تمہاری جتنی ہمدردی ان میں بھی ہے جانور نہیں یہ بھی آدمی ہیں مگر کیا کریں

غلسی نے وہ عقل اور ہمدردی سب خاک میں ملا دی۔ چلو خیر خدا کا شکر ہے ایک جماعت تو ہم میں بھی ایسی نکل آئی۔ عقل میں بھرپور۔ قومی دھن میں چکنا چور۔ بچہ نہ کچا کر یا نہ دھرا۔

اب میں تمہارے خط کا جواب دوں۔ طرز تحریر نہایت خوب خیالات کی بلند پروازی چشم بد دور جدت قابل تحسین اور ہمت لائق شاباش۔ تمہارے پاس اس یقین کی کیا وجوہ ہیں کہ مشرقی خواتین ہماری رائے میں ارزل المخلوقات ہیں۔ کس نے کہا کب کہا اور کیوں کہا جس نے کہا غلط۔ جب کہا غلط اور جس کے سامنے کہا غلط۔ فطرت کی تقسیم میں کمی بیشی تو ممکن ہے لیکن آسمان زمین کا فرق جو کہے وہ بیوقوف جو سمجھے وہ کودن۔ ہمارا ایمان یہ ہے کہ یہی چار دیواری میں بیٹھنے والیاں اگر زیور علم سے آراستہ ہوں تو ان کے منہ سے ایسے پھول جھڑیں کہ مغرب بھی اس خوشبو پر لٹو ہو جائے۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ ہماری رائے میں طبقہ اناث پر انسانیت کا اطلاق جائز نہیں۔ گو فریقین میں تھوڑا سا امتیاز قدرت نے رکھا اور نظام عالم مقتضی تھا کہ یہ امتیاز رہے تاہم نہ یہ ہمارا یقین نہ ایمان نہ رائے نہ خیال کہ یہ تفریق اس حد تک پہنچ گئی کہ عورتوں کی طبیعتیں ایسے مادے سے محروم ہیں جو علم سے متاثر نہ ہو سکے۔ لیکن اتفاق مرض لاعلاج ہے۔ ضرورت نے کیا مجبور۔ افلاس نے چھائے ڈیرے۔ مقاصد حیات محدود رہ گئے۔ زن و شو کے اتصال کا حاصل یہ ٹھہرا کہ دونوں زندگیاں باطمینان ختم ہو جائیں اور اگر میری رائے غلط نہ ہو تو میں کہونگا اور علی الاعلان کہونگا کہ یہ اصول مقدم ہونے کے قابل ہی تھا۔

تمہارا سوال ہو کہ مجکو کیا حق حاصل ہے کہ میں صغیرہ دلہن کو کہیں جانے کے واسطے اپنی اجازت کا محتاج رکھوں۔ تمہارا یہ اعتراض صحیح ہے یا غلط۔ گر مجھ پر نہیں قدرت پر ہے۔ قدرتاً عورت اس طرح پیدا کی گئی ہے کہ وہ مرد کی خفیف سی نگرانی میں کام کر سکے۔ جن

قوموں نے اس اصول کو نظر انداز کیا وُہ ہرگز کامیاب زندگی بسر نہ کرسکیں۔ واقعات پیشِ نظر ہیں مُنہ نہ کُھلواؤ۔ خود ہی سوچو اور آپ ہی غور کرو۔ فطرت نے جیسا کہ تم خود ہی کہتی ہو۔ عورت کی طبیعت میں وُہ اسباب بلکہ بیچ ہیں جو ایک مرد کا دل مسخر کرنے میں اور اُسکا دل راغب کرنے میں ہر وقت اور ہر حال میں مددگار ہیں۔ ضرورت صرف اتنی ہے کہ مواقع اجازت دیں۔ نظارہ اس کے بعد گفتگو اور پھر میل جول وغیرہ وغیرہ۔

کیا وُہ شئے جو فطرتًا یہ تمام سامان ساتھ لیکر آئی۔ اس بات کی محتاج نہ تھی کہ اگر اسکی یہ کامیابی معیوب ہو تو اس کے تعلقات پر نگاہ رکھی جائے۔ اگر کوئی عورت بحیثیت بیوی ہونے کے کسی غیر جلسہ میں شوہر کی اجازت ضروری سمجھتی ہے تو وہ کس گناہ کی مرتکب ہے؟ گو یہ تسلیم کرنے پر مَیں بھی تیار نہیں ہُوں کہ عورتیں ناقص العقل ہیں نہ انصاف مجھے یہ کہنے کی اجازت دیتا ہے کہ ہر مرد ہر عورت سے عقلمند ہے۔ لیکن اس سے تمہیں بھی انکار نہ ہوگا کہ بیویاں جب تک تعلیم کی اس حد پر نہ پہنچ جائیں جہاں خاوند ہیں وُہ انکے صلاح اور اُنکے مشورے کی یقینی محتاج ہیں۔

بدظنی توبہ توبہ نعوذ باللہ تم بھی کن قرنوں کا جھگڑا لے بیٹھیں۔ اگلے زمانہ کی تو مَیں کہتا نہیں۔ کیا تعجب ہے ایسے ہی ہونگے۔ لیکن اب تو کوئی ایسا ہی بے غیرت ہوگا جو بیوی جیسی رفیق سے بدظن اور عورت جیسی مونس سے بدگمان۔ میل کا بیل۔ رائی کا پربت۔ تل کا پہاڑ۔ مکھی کا ہاتھی۔ صد آفرین تمہاری طبیعت کو جو سمجھ میں آیا وُہ لکھ بیٹھیں۔ باتیں کیں تو وُہ کچھ خط لکھا تو یہ کچھ عجوبہ بہن! تم تو سچ مچ ہی کی عجوبہ نکلیں۔ جو اصل بات ہے وُہ تم نہ کہو مَیں کہوں اور ڈنکے کی چوٹ کہوں واقعات آئے سامنے جھگڑے ہُوئے پیدا۔ اندیشہ ہونا ہی تھا جب امکان ممکن ہے تو انسداد خطا کیا اَور گناہ کیوں؟ اب اس انسداد کو بدظنی کہو بدگمانی سے

تعبیر کرو جو چاہو کہو جو چاہو سمجھو یہ وہی انسداد ہے جو پردے کی صورت میں سامنے آیا۔ تم نے پردۂ شرعی کو لیا۔ اگر یوں ہی سہی۔ یہ کس کی سُنی سنائی کہہ رہی ہو تم نے تو سُنا ہوگا یا پڑھا ہوگا۔ مجھ سے پوچھو کہ مہینہ نہ دو مہینے اکھٹے تین سال ممالک اسلامیہ میں گذارا آیا۔ سچ یہ بہن! یہ پردۂ شرعی کی آڑ وہ پکڑتے ہیں جو پردہ پسند نہیں کرتے۔ بچی ہو عقل کی کچی ہو! اتنا تو سوچو پردہ شرعی وہاں ہو جہاں قانون بھی شرعی ہے۔ مجال ہو کوئی ٹیڑھی آنکھ سے تو دیکھ لے۔ تمہارے ہاں تو اگر ایک گھر سے دوسرے گھر ڈولی جائے تو رستے میں دو ہزار گالیاں کانوں میں آئینگی۔ شراب زنا یہ وہ سب جائز۔ ٹوکنے والا نہ روکنے والا۔ میں تمہارے اس خیال سے متفق ہوں کہ قدرت کے انعام میں مرد و عورت دونوں برابر کے شریک ہیں۔ عورتوں کو بھی کائنات سے محظوظ ہونے کا وہی حق حاصل ہو جو مردونکو اور اگر ایک بیوی خاوند کی اجازت وصلاح سے تفریح و دلچسپی کے سامان ایسے پیدا کرے جو اس کے فطرتی جوش کے واسطے برائی کی طرف محرک نہ ہوں تو قطعی جائز۔

مجھ کو اس سے انکار نہیں کہ مسلمانوں نے نکاح ثانی کے مقابلے میں نفس کی اطاعت کی اور مذہب کی آڑ اُن کے لئے اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہوگئی۔ میری رائے میں یہ لوگ اپنے اس فعل کے ذمہ وار ہیں اور انکو بہت بڑی جوابدہی کرنی ہے۔

یہ مسلمہ اصول اور مقررہ قانون ہو کہ انسان حالتِ موجودہ میں قانع نہیں ہوتا اور ہر جدت میں لذت ہوتی ہے۔ یہ وجہ ہوئی ہے اس امر کی کہ تم مغرب کی اس قدر دلدادہ ہوئیں لیکن تم تو تم میں کہتا ہوں خدا دشمن پر بھی مغرب کا پرچھانواں نہ ڈالے۔ خدا نہ کرے کہ ہم وہ دن دیکھیں جب ہماری عورتوں کا مقصدِ حیات

ایک سے زیادہ شیدا پیدا کرنا ہو۔ تم کو سارے لنڈن میں بمشکل دس پانچ عورتیں ایسی ملجائیں تو ملجائیں ورنہ آوے کا آوا۔ کنبے کا کنبہ۔ قوم کی قوم ملک کا ملک اسی رنگ میں رنگا ہوا دکھائی دیگا۔ گو ہمارے ہاں بعض ایسے کمبخت بھی موجود ہیں جنکے وجود سے یہ کلنگ کا ٹیکا ہمارے ماتھے پر لگا انہوں نے درحقیقت عورت کی قدر و منزلت میں انصاف نہ کیا۔ لیکن کیا مغرب میں ایسے لوگ موجود نہیں جنہوں نے بیویوں کی زندگیاں بےچین ہی نہیں بلکہ ایسی برباد کیں کہ مظلوموں نے روتے ہی روتے بسر کی۔

اصول پر نظر ڈال کر دیکھو تو میں مدعی ہوں اس اعلان کا کہ جو وقعت ہم نے اپنی خواتین کی کی۔ وہ مغرب کے فرشتوں کو بھی نصیب نہ ہوگی۔ ہم نے اگر ان کے علمی خلعت چھین لئے تو مجبوری اور معذوری سے۔ لیکن انکو عفت و عصمت کے ایسے گجرے پہنائے جو قیامت تک مرجھانیوالے نہیں۔ اس عسرت و لت اس فقیری اور ناداری میں ان موتیوں کی آب پر حرف نہ آنے دینا۔ ہمارا ہی کام تھا۔ رہا علم سے محروم رکھنا۔ یہ ہماری مجبوری بھی تھی اور غلطی بھی لیکن اس کے معنی یہ نہ ہونگے کہ ہم نے قدر نہ جانی مجھے اس کے تسلیم کرنے میں عذر نہیں کہ ان کو علم سے محروم رکھنے میں ہم نے انکو کیا اپنے تئیں سخت نقصان پہنچایا اور اب اس کی تلافی کے لئے صدیاں درکار ہیں۔ لیکن یہ تو میں کبھی نہ کہونگا کہ اندھا دھند مغرب کی تقلید پر ہم کمربستہ ہوجائیں اور ان کے ہر قول و فعل کو سر آنکھوں پر رکھ لیں۔ یہانتک کہ عفت و عصمت شرم و حیا بچوں کی لاج باپ دادا کی عزت سب نظر انداز ہوجائے۔

پردے کا ذکر چھیڑ کر تم نے میرے پکے پھوڑے میں ٹھیس لگادی۔ آہ! عجوبہ یہ تو مسلمانوں سے رخصت ہوا آج ہوا تو کل ہوا تو یہ تو اب رک سکتا نہیں۔ یہ جوان

شبر دم توڑ رہا ہے اور کوئی دم میں رخصت ہوا۔ نعمت تھا یا مصیبت۔ جو کچھ بھی تھا
کوئی دن کا مہمان سمجھو۔ پچاس برس کے اندر ہی اندر اس کا خاتمہ سمجھ لو۔ خدا کرے
تمہارا خیال اچھا ہو اور اسوقت کے لوگ تمہیں دُعا دیں۔ لیکن مجھ سے پُوچھو تو
میں یہ کہونگا کہ آنے والی نسلیں سر پیٹ لینگی اپنی ٹانگیں کھولینگی اور آپ لاتوں مرینگی؟

راشد الخیری

از مولوی سید احمد صاحب دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ

کلام مہر (مصنفہ منشی سورج نرائن صاحب مہر دہلوی - پورٹر آنریری ممبر سررشتہ تعلیم پنجاب لاہور)

مدت سے لالہ سورج نرائن صاحب مہر دہلوی کا مجموعہ کلام واجب الاحترام ہماری میز پر جلوہ افروز ہے اور اسکی رنگ برنگی معنی خیز شعاعیں ہمارے دل ہمارے دماغ ہماری آنکھوں پر پرتو افگن۔ جس طرح آفتاب عالمتاب جمادات۔ نباتات سے لیکر حیوانات تک کو کہیں اپنی روشنی سے کہیں اپنی حرارت سے۔ کبھی بخارات اُٹھا کر۔ کبھی مینہ برسا کر فائدہ پہنچاتا ہے۔ اسی طرح کلام مہر بھی مختلف المذاق۔ مختلف الطبائع۔ مختلف الخیال اصحاب کو اُن کے رجحان کے موافق لُطفِ سخن دکھاتا ہے۔ اسکی وجہ کیا ہے یہی کہ حقانی رنگ اس میں ہے۔ توحید تصوف۔ گیان۔ بیراگ۔ معرفتِ الٰہی عشق باری تعالیٰ مقصد حیات اس میں ہے۔ اخلاقی مضامین کا ذخیرہ یہ ہے۔ نیچرل نظموں کا کچکول یہ ہے۔ ویدانت کے موحدانہ خیالات۔ سنسکرت کے اچھوتے فلسفانہ استعارات۔ اُسکی انوکھی اور دلاویز تشبیہات۔ یورپ کی محققانہ معلومات۔ عربی و فارسی مذاق کے نکتے۔ اُردو کی لذت بخش سلاست کی پُرلطف چاشنی جو کچھ چاہو اس عمر عیار کی زنبیل میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ مضامین کی جدت۔ خیالات کی ندرت۔ الفاظ کی شوکت۔ بندش کی چستی اس پر سنجیدگی و متانت معنی آفرینی کی خداداد قدرت اور سونے میں سہاگہ ہے۔ یہ مجموعہ کل اصنافِ سخن پر حاوی ہے۔ قصائد۔ غزلیات۔ مخمسات۔ مسدسات۔ مسبعات۔ مثمنات۔ مثنویات۔ قطعات۔ رباعیات وغیرہ کوئی چیز نہیں

تاج و نگین

کسی زمانہ میں چتر و تخت کی طرح لازمۂ سلطنت و جہانداری تھے فرمانروائی کی ذات کے ساتھ ان کا موجود و وابستہ ہونا لابد تھا۔ جس درجہ ایشیائی تمدّن و تہذیب بڑھی اُسی قدر اظہارِ شان و شوکت نمائش جاہ و حشمت میں بھی ترقی ہوتی گئی۔ آخر ہر کمالے را زوالے۔ مغربی روشنی کا اثر یا انسان کی سادگی پسند جبلت کا تقاضا کہئے جو رفتہ رفتہ ان تکلفات میں اختصار ہونے لگا۔ مشرقی تجمل و سطوت کی یادگار دولت عثمانیہ نے بھی مدت ہوئی یہی روش جدید اختیار کرلی۔ تاج مرصع کا مقام طربوش تمدی نے پسند کیا۔ طرۂ جواہرین کی جگہ

---

۴ چھوٹی۔ اس کے مضامین زیادہ تر مسلسل ہیں اور ایسے مضامین کا تسلسل ہی لطف دیتا ہے۔ اسکے باوجود جلد کی وزبائی۔ خط کی خوشنمائی۔ کاغذ کی چکنائی۔ چھپائی کی صفائی۔ صاحب کلام کی طبیعت کی نفاست اور صفائی کو اور بھی ظاہر کر رہی ہے۔ ۴۳۶ صفحوں پر ایک یا ڈیڑھ ہزار روپیہ صرف ہوئے ہیں۔ فیاض مصنف نے بڑے بڑے کتب خانوں، نامی انجمنوں۔ اخباروں۔ کالجوں اور احباب وغیرہ کو بہت سے نسخے ہدیتّہً مرحمت فرمائے ہیں اور ہم بھی ان عطیہ کبریٰ (؟) یہ مجموعہ مقامات ذیل یا خاص مصنف صاحب سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

دہلی۔ دریبہ کلاں۔ مینجر امپیریل بک ڈپو۔

جالندھر۔ مینجر دہلی ہوس۔

پٹیالہ۔ درشنی دروازہ۔ بہادر اینڈ کو۔

لاہور۔ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ یا خاص مصنف۔

مجلّد کی قیمت ۶ غیر مجلد کی ۸

سیاہ پھندنے نے پائی - درفش و پرچم کی رفعت لوا و علم کے ہاتھ سے برباد ہوئی - خاتم نگین کی ضرورت بھی زمانہ کی رفتار نے باقی نہ رکھی - مہر کا کام محض گردش قلم یا چند لکیروں سے چلنے لگا - ہاں نو آئینانِ ترک میں تحفظِ مرتب یا شانِ شہنشاہی کے لحاظ سے ایک کشش مخصوص یا وضع معین ہوگئی جو طغرائے سلطانی سے موسوم ہے - یہی عین منشائے فطرت انسانی ہے کہ عوام و خواص میں کچھ نہ کچھ امتیاز رہتا - تجربہ شاہد ہے کہ امرا و ملوک کا ہر انداز ہر پرواز ایک نیا رنگ نیا آہنگ رکھتا ہے (علےٰ قدر عقولھم) جمہور کو بھی اس سے دلچسپی ہوتی ہے - اس نئے فرمانروایانِ آستانوں کے طغرا و اس کی آغاز و سبب - بابِ عالی کی تشریح - علم عثمانی رسم سلامک کی ابتدا و توجیہ کے نسبت قدردان ناظرین کے حضور میں کچھ عرض کرنا فضول نہ ہوگا -

تاجداران بنی عثمان سے معمولاً ہر ایک کا ایک طغرائے خاص ہوتا ہے - بس اسی کو اب شعار سلطانی کہنا چاہیئے جس سے مراد صاحب تاج و تخت کے دستخط ہیں - گو تغیر سلاطین سے شکل طغرا بدل جاوے مگر اس کی وضع میں فرق نہیں آتا - اسکی ابتدا و اصلیت میں ہرچند کہ اختلاف ہے مگر مسلماً یہ رسم ہے ارث قدیم - جسکی پابندی مدت مدید سے ہوتی آتی ہے - ایک روایت دانایانِ ترک کی یہ ہے کہ جب مراد اول سنہ ۱۳۶۰ء میلادی میں مملکت تورصہ پر قابض و متسلط ہوا تو اس نے جمہوریہ اغوزہ سے کوئی معاہدہ کیا تھا (یہ ملک اب قلمرو آسٹریا ہنگری میں شامل ہے) اولوالعزم سلطان نے اس عہدنامہ پر اپنے پانچوں انگلیوں سے نشان کر دیا تھا - موبدان سلطنت نے ان نشانات انگشت کی تاویل یا اس سرنوشت کی تعبیر فرمائی - السلطان

مراد ابن السلطان اورخان اعزہ اللہ - الناس علےٰ دین ملوکھم

جمالہ کتاب و خطاط بھی اس رسم کی تقلید کرنے لگے - حتّٰی کہ یوماً فیوماً طغرائے شاہی دراز و درست ہو کر صورت موجودہ معروفہ میں آگیا - یعنی باہر کو دونوں جانب

کشادہ مگر وسط میں تنگ ہوا ہے۔ باوصف تبادلہ سلاطین کے ہنوز یہی وضع و طرز قائم و برقرار ہے۔

گو بعض اہل تحقیق کو اس واقعہ سے قطعاً انکار ہے اور انکی حجت بھی ضرور وقیع و قابل التفات ہے کہ مراد اوّل جو علم و کمال سے آراستہ تھا اُس نے اپنی ہنرمند والدہ نیلوفر سلطانہ کے آغوش میں تربیت و تعلیم پائی تھی۔ یہ خوش سلیقہ ملکہ یونان کی شاہزادی تھی جسکو مراد کے باپ نے عین شب عروسی میں نامراد نوشاہ سے چھین لیا تھا۔ مراد خود لکھنے پڑھنے میں مشاق علم و دانش سے بہرہ ور بڑا باتمیز و باادب تھا۔ پھر سونے پر سہاگہ شفقت و توجہ مادرانہ کا اثر و فیض ہوا۔ مراد کو کیا حاجت تھی کہ کسی نوشتہ پر عوض دستخط نشانات انگشت ثبت کرتا۔ لیکن با مرسا ہمہ دان مورخ تسلیم کر رہا ہے کہ یہ صلحنامہ راغوزہ گذشتہ صدی تک دستبرد زمانہ سے محفوظ تھا جس پر سلطان مراد کے پنجہ کا چھاپ اُس نے خود دیکھا ہے۔

دوسری جانب چند حقیقت جو حضرات کا قول ہے کہ آل عثمان کا یہ فعل باتباع سنت سنیہ ہے۔ رسول مقبول صلعم رسائل و خطوط کو نشان انگشت سے مجلل فرمایا کرتے تھے۔[۵۱] نکتہ رس بزرگوں کی یہ دلیل کچھ کم قوی نہیں کہ جب سلطان محمد خان دوم قسطنطنیہ میں داخل ہوا تو مظفر و منصور بادشاہ نے اپنا ہاتھ خاک و خون میں تر کرکے کنیسہ کبری یعنی ایا صوفیہ کی دیوار پر لگا دیا تھا۔ اسی وقت سے یہ عظیم الشان گرجا غازیان اسلام کا سجدہ گاہ ہوا ہے ؎

بہ بیں کرامت بتخانۂ مرا اے شیخ کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

[۵۱] تنبیہ حکمائے فرنگ کو انتہا یا لوجی یا فن نشانات انگشت پر بڑا ناز ہے۔ اس اکتشاف علمی کا سہرا اپنے سر باندھتے ہیں۔ مگر دیدۂ حقیقت بین گواہ ہے کہ سوا تیرہ سو برس پیشتر اسکا پتہ امی لقب حکیم عرب نے دیا تھا اور جہاں تک تاریخ بتا سکتی ہے سب سے پہلے مطاع عالم و آدم محمد مرسل نے نشان انگشت تحریرات پر ثبت فرماتے تھے۔

اسے خونیں رسم کے مضمون کو ہمارے زمانہ کے ایک شاعر نے بھی خوب ادا کیا ہے

میرا مرنا انکے گھر شادی ہوئی خون کے چھاپے لگے دیوار میں

بہرکیف اسکی اصلیت کچھ ہو یہ طغرا بھی تبادلہ سلاطین کے ساتھ بدلتا رہا ہے چنانچہ فرمانروائے حال سلطان محمد خاں خامس کے روبرو بھی بہت سے نمونے پیش کیے گئے تھے - مگر پسند آپ نے یہی فرمایا - جو سب سے بہتر اور فی الواقع قابل قدر تھا۔

کہتے ہیں کہ آل عثمان کی دیرینہ تقلیدات ہیں یہ بھی رائج ہے کہ سلطان وقت کو بادشاہ کہیں - اسکی توجیہہ یا ترکیب اخوی سے چاہے کسی کو تشفی نہ ہو مگر روایت یہی ہے کہ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے باد کہلاتا ہے - یعنی حامی جو و ونو گروہ کی سرپرستی و دستگیری کرے اور صفت خسروانہ کے لحاظ سے شاہ اس لئے کہ اپنے ابا و اجداد کا جانشین اور انکی مملوکات و مقبوضات پر حکمران ہے -

رہا **باب عالی** - اس سے مقصود خیمہ سلطانی کا دروازہ تھا جو جنگ و جدل میں بھی برابر کھلا رہتا تھا - اس جد و جہد کے زمانہ میں مسلمان بادشاہوں کا دستور تھا کہ مہمات و فوج کشی میں سالار سپاہ خود ہوتے - کیا ہی خود کرتے - میدان میں سب کے سامنے رہتے اور ساری فوج کے آگے چلتے - جب لشکر قیام کرتا خیمہ و خرگاہ نصب ہوتے مو کب خسروی پیش از پیش رہتا خیمہ سلطانی کا پھاٹک تمام خیموں کے دروازوں سے ممتاز و بلند اس ملک یا سرزمین کی سمت رکھا جاتا جس کا فتح کرنا مقصود ہوتا یا غنیم کے رخ رہتا جسکی سرزنش و سرکوبی مدنظر ہوتی - تاکہ سلطان کے لئے درخیمہ بھی حاجب و حائل نہ رہے اور اس کو ایک لمحہ کے لئے بے پرواہ و غافل نہ کردے -

اسی رفعت و عظمت کے اعتبار سے ابتدا اسے باب عالی (در بلند) نام رکھا گیا تھا مگر اب یہ ایک لقب قرار پا گیا جس سے مراد مقر وزارت (سیکریٹریٹ) ہے

علم - دراصل وہی بزنطی نشان ہے جسکو رومن لوگوں سے اڑا اول ازاسی نیلوفر

رومیتہ کے بیٹے) نے چھینا تھا۔ یہ اب تک ویسا ہی سُرخ رنگ کا چلا آتا ہے جس کے وسط میں ہلال سفید نمودار ہے۔

محفلِ سلامک۔ اس رسم کی بنیاد یُوں پڑی تھی کہ ابتدائے عہد میں کوئی بادشاہ کسی قاضی کے روبرو شہادت دینے گیا تھا۔ خُداترس قاضی نے اس کی گواہی اس عُذر سے نامنظور کی کہ وُہ نماز کو حاضر نہ ہوتا اور باجماعت ادا نہ کرتا تھا۔ اہلِ شرع و ورع کے نزدیک عادل و صحیح الایمان نہ تھا۔ نہ اسکی شہادت قابلِ قبول تھی۔ غیرتمند سُلطان کو شاق و ناگوار تو ہُوا مگر اس روز سے پابندی نماز و جمعہ کا پختہ عہد کر لیا جس پر تا دمِ مرگ قائم رہا۔ اُسی کی متابعت و تقلید تمامی اولاد و احفاد کرتے آئے ہیں۔ بعض نے تو اس روش کے نباہنے میں فوق العادت تکلیف اور مشقت بھی اُٹھائی ہے۔ سُلطان عبدالمجید خاں کا ذکر ہے کہ باوجود مرض الموت میں گرفتار اور بورڈت میں مُبتلا ہونے کے نماز جمعہ کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ صُورت حال کیفیت اصلی کا پتہ دے رہی تھی۔ دیندار سُلطان پشتِ زین پر اور ندیم و مصاحب چاروں طرف سے سنبھالے ہُوئے تھے۔ سُلطان مراد بھی بحالت علالت برابر مسجد کو جاتے رہے۔ سُلطان معزول عبدالحمید خاں ثانی کی تاریخ شاہد صادق ہے کہ بجز ایک بار کے کبھی نماز باجماعت میں پیچھے نہیں رہے۔ یہ ضرور تھا کہ خود دولت نے صُورت اجتماع یا احتفال کو بدل دیا تھا مگر انضباطِ اوقات و محافظت صلوٰۃ میں سرگرمی روزافزوں تھی۔ انکے باپ دادا جماعت کثیر کے ساتھ بڑے اژدحام و احتشام سے مساجد آستانہ کو جایا کرتے تھے اسکے بجائے سُلطان سابق نے اپنے لئے ایک جدا مسجد قصر یلدز کے سامنے تعمیر کرائی تھی جس میں وُہ طاعت ایزدی بجالاتے تھے۔ جلوس فوجی ہمرکاب ہوتا۔ ترکتانان البانیا کی تہ بہ صفوں میں ہو کر گذرتے۔ جب سے دستور یا پارلیمینٹ قائم ہُوا یہ انتظام و اہتمام بھی درہم برہم ہو گیا۔ اور اتنی ہیبت و جبروت والا شہنشاہ لرزہ براندام غالب خوش نوا کا یہ قطعہ پڑھتا ہُوا بے برگ و نوا تخت و کلاہ سے رخصت ہُوا۔

ما بجائے کہ زجم ماند قناعت کردیم
بہ سکندر بہ رسید آنچہ ز دارا ماند
سخن از حشمت دارا نہ ہمانا نرسد [illegible]

پرندوں کی نمائش

یوں تو لندن میں آئے دن طرح طرح کی نمائشیں ہوتی رہتی ہیں۔ کیونکہ نمائش کا جو طریق آج کل مروج ہو۔ ہر قسم کی تجارت کی حوصلہ افزائی کے لئے مفید پایا گیا ہو۔ عرصہ دو تین سال کا ہوا لندن میں مجھے ایک نمائش میں جانے کا اتفاق ہوا جس میں طرح طرح کے پرندے جمع کئے گئے تھے۔ اور جہاں ایک ایک پرندہ جواہر کے دام پاتا تھا۔ اس نمائش کا مختصر سا حال لکھتا ہوں۔ امید کہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

(رضی الدین احمد)

اس نمائش میں چار سو اکیس ذات کے مرغ یا مرغیاں تھیں اور کل مرغ یا مرغیاں ملا کر ۸۰۲۷ تھیں۔ اسی طرح زیادہ قیمتی مرغ یا مرغی اس میں دو ہزار پونڈ یعنی تیس ہزار روپے کی تھی۔ اس سے کم قیمت کی تو سینکڑوں تھیں۔ مگر دو پونڈ یعنی تیس روپیہ سے کم کوئی چڑیا نہیں تھی۔ ہمارے غریب ملک کے رہنے والے تیس ہزار روپیہ ایک مرغ کی قیمت سنکر بہت تعجب کرینگے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے ایک مہربان نے ایک بٹیر کو لکھنؤ میں مبلغ للعہ روپیہ کو بیچا تھا تو لوگ لینے والے پر ہنستے تھے کہ آخر اس بٹیر میں کیا صفت ہو جو اتنے روپے دیئے جائینگے۔ کیا یہ روز موتی اگلیگا۔ مگر یہ سب دولت کے کھیل اور ہر جنس کی قدر افزائی کے شوق کے کرشمے ہیں کہ یہ مرغ اور مرغیاں نہ تو موتی اگلتی ہیں اور نہ سونے کا انڈا دیتی ہیں (جیسا بچپن میں کہانیوں میں سنا کرتے تھے) لیکن اُن میں ایسی صنعتیں ہیں جن سے اتنی قیمت مانگی جاتی ہے۔ اور شوقین لوگ دیتے ہیں۔ اس نمائش کے چند مرغوں کی حالت لکھتا ہوں۔

نمبر ۱۴۶۶ نر ایک اور دو برس کے اندر۔ چت کبرا۔ سپید چتیاں زیادہ ڈیڑھ گز لمبا ہے (سر سے لیکر پنجوں تک) وزن ۷ سیر۔ قیمت ۲۰۰۰ پونڈ۔

نمبر ۱۴۷۶ مادہ ایک اور دو برس کے اندر۔ چت کبرا۔ سپید چتیاں زیادہ ہیں۔ وزن ۳ سیر۔ قیمت ۲۰۰۰ پونڈ۔

نمبر ۲۰۵ مادہ۔ سرخی مائل۔ وزن ساڑھے پانچ سیر (ایک برے کے برابر) قیمت ۲۵۰ پونڈ۔ میرے سامنے ایک لیڈی سو پونڈ دیتی تھی۔ مگر مالک نے نہیں بیچا۔

نمبر ۱۵۷۹ نر سپید بے داغ (جیسا کہ اکثر پیرزادے نذر وغیرہ کے لئے تلاش کیا کرتے تھے) قد اور وزن معمولی۔ قیمت ۲۰۰ پونڈ۔

جزائر سماترا کے بھی مرغ موجود تھے۔ جن کی سب سے زیادہ قیمت ۱۰۰ پونڈ تھی جاپان کی مرغیاں بھی تھیں۔ اُن میں ایک خاص صنعت یہ تھی کہ دُم کے پر سمیٹ لیتی تھیں۔ قیمت ۵ پونڈ ۵ شلنگ تھی۔

ہمارے ہندوستان کے بھی مُرغ تھے۔ جنکی سب سے زیادہ قیمت ۱۰۰ پونڈ تھی (ہم کو اس بات سے یہ سبق ملتا ہے کہ وہی چیزیں جن کی ہم اپنے ہاں قدر نہیں کرتے ہیں۔ اُنکو لوگ یہاں لاکر تھوڑی سی محنت اور توجہ کے ذریعہ قدر کے قابل بنا لیتے ہیں)

ملایا کے مرغوں کی قیمت سب سے زیادہ ۲۰۰۰ پونڈ تھی۔ اور وزن میں سب سے زیادہ بھاری مرغ نمائش بھر میں وہیں کا تھا۔ جسکی تفصیل وزن و نرخ وغیرہ ذیل میں درج ہے:۔

نمبر ۳۲۱۳ نر سُرخ۔ دو گز لمبا۔ وزن ۷ سیر۔ قیمت ۲۰۰۰ پونڈ۔

ہسپانیہ کے مُرغ کی سب سے زیادہ قیمت پچاس پونڈ تھی۔

بط سب سے زیادہ قیمتی ہندوستان کی تھی جسکی قیمت ایک سو پونڈ تھی۔ اور جو سفید میراغ تھی۔ معمولی قدر۔ کوئی اور صنعت نظارہ اس میں نہیں معلوم ہوتی تھی۔ علاوہ ان کے اور عجیب عجیب مرغ اور مرغیاں تھیں۔ گو اُن کی قیمت کچھ ایسی زیادہ ان قیمتوں کے مقابلے میں نہیں تھی۔ یعنی سو پونڈ سے لیکر پانچ یا چھ پونڈ تک تھیں۔ سفید مرغی کی ایک قسم تھی جس کے سر پر گوشت کا ایس۔ گو وہ نہیں بالکل پگڑی کی طرح کا بنا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے طول کی پگڑی باندھ دی ہے ایک چھوٹی مرغی تھی۔ وزن بھی آدھ سیر کے اندر۔ بالکل تیتر کا رنگ۔ تیتر ہی معلوم ہوتی تھی۔ چند مرغ اور مرغیوں کی حلق بہت پھولے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ گھینگا نکل آیا ہے۔

اب کبوتروں کا حال سنئیں :-

سب سے زیادہ قیمتی کبوتر نمائش میں ۵۰۰ پونڈ کا تھا۔

نمائش میں کل ۱۵۵ ذات کے کبوتر تھے (ہمارے ہندوستان میں اس سے زیادہ اقسام کے کبوتر نکلینگے۔ اور ہر ایک اپنی اپنی قسم میں یکتا ہوگا) تعداد میں ۱۷۰۳ کبوتر تھے۔

نمبر ۳۔ ایک سال کا پٹھا۔ ۲۰ انچ لنبا۔ پاموز۔ دو بازو۔ آگے کا پوٹا پھولا ہوا۔ ذات کا اتفاہیں ہے۔ یعنی وہ خود نہیں تنتا ہو۔ بلکہ معلوم ہوتا ہو جیسے کسی کبوتر کے گھینگا نکل آتا ہو۔ پوٹا اس قدر پھولا ہوا ہے۔ کہ آگے سے مُنہ نہیں دکھائی دیتا ہے۔ قیمت ۵۰۰ پونڈ (اس قسم کے کبوتر ہندوستان میں نہیں دیکھے)

نمبر ۳۰۔ مندلی نر سنہ ۱۹۰۴ کا پٹھا۔ پوٹا اتنا بڑا ہے کہ آگے سے سر نہیں دکھائی دیتا۔ اس کا پوٹا سب سے زیادہ پھولا ہوا ہے۔ قیمت ۱۰۰ پونڈ۔

نمبر ۱۹۰ سپید بے داغ تھا۔ اس قدر تنتا ہے کہ اس کے سینے پر لمبور کھدو اور نہ گرے (جو کہ خاص تھا کی صفت ہے) حالانکہ پر نہیں کٹے ہیں۔ ورنہ شاید بعض وقت اُلٹ جاتا۔ قیمت ۱۰۰ پونڈ۔

نمبر ۲۱۲ مادہ سپید بے داغ تھا۔ بجائے اس کے کہ یہ کبوتری تنتی ہو۔ اسکی دم بہت اُٹھی ہوئی ہے۔ بالکل چھتری کی طرح سے سر پر پھیلی رہتی ہے قیمت ۱۰۰ پونڈ۔ اس کے علاوہ دوسرے رنگوں کے کبوتر موجود تھے۔ مثلاً ہرے۔ زاغ۔ کھیارے۔ صندلی۔ کاسنی۔ مکھی۔ سیاہ دوباز۔ موتی چور۔ چوٹی دار وغیرہ چوٹی دار کی سب سے زیادہ قیمت ۱۰۰ پونڈ تھی۔

نمبر ۴۹۶ کھیارا۔ کیسی آنکھوں پر۔ خوردنکا۔ چونچ بالکل معلوم ہی نہیں ہوتی ہے۔ چونچ پر کھال کا بہت بڑا گچھا ہے۔ قیمت ۲۵۰ پونڈ۔

نمبر ۵۰۰ سپید۔ بیداغ۔ موتی چور۔ قیمت ۱۰۰ پونڈ۔

ایک ذات کی کبوتری تھی جسکو یہاں اُلو کہتے ہیں۔ وُہ خوردنکی ہوتی ہے۔ آنکھ کے پوٹے بہت بھاری ہوتے ہیں۔ صورت میں اُلو سے بہت مشابہ ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ قیمتی ۱۰۰ پونڈ۔

جرمن کے بھی کچھ کبوتر نمائش میں تھے۔ مگر افسوس ہمارے ہندوستان کے کبوتر نہیں تھے۔ حالانکہ ہندوستان میں اس وقت بھی بہت نایاب کبوتر پائے جاتے ہیں۔ ایک خاص ذات جسکو میں یہاں نہیں پاتا ہوں۔ نہ کہیں نمائش میں دکھائی پڑی۔ ہمارے ہندوستان میں بکثرت ہے۔ وُہ لوٹن کبوتر ہیں۔ جنکی میں خیال کرتا ہوں کہ یہاں بہت قدر ہوتی۔ کیونکہ ہمارے ہاں کے اُڑان کے کبوتر اور گرہ باز کی تو یہاں قدر ہو ہی نہیں سکتی۔ مگر لوٹن تو ایسی چیز ہے جو ہمیں کے واسطے پیدا کیا تھا۔ جو لوگ کبوتروں کا تماشہ آسمان پر دیکھنے سے محروم ہیں

وہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر تماشا دیکھ لیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اگر ہندوستان کے اچھے اڑن کبوتر یہاں بھیجے جائیں تو شاید اُن کی قیمت ۵۰۰ پونڈ سے زیادہ ملے۔ اور پھر مقابلی لوٹن کی اَور بھی زیادہ قدر ہو۔

گو یہ نمائش پرندوں کے لئے تھی۔ تاہم ایک گوشے میں کچھ چوہے اور خرگوش بھی دکھائے گئے تھے۔ ہر رنگ کے چوہے موجود تھے۔ سفید۔ سیاہ۔ صندلی۔ سبز خاکی۔ اور ہر قد کے چھوٹے بڑے منجھولے۔ اسی طرح خرگوش بھی ہر رنگ کے موجود تھے۔ ایک قسم خرگوش کی تھی جس کے چار کان تھے۔

یہ گراں قیمتیں جو اِن مختلف جانوروں کی لکھی گئیں۔ یہ محض چڑیوں کی نہیں بلکہ اُنکے رکھنے والے اپنی محنت اور نگہداشت کی قیمت بھی لیتے ہیں۔ ان لوگوں سے دریافت کیجئے تو ہر چڑیا کا نسب نامہ اُنکے پاس لکھا ہوا ہے کہ کس طرح سے اُن کی ماں اور باپ کی حفاظت کی گئی ہے۔ وہ یہ بھی بتائینگے کہ اُن کو کیا کھانا دیا جاتا ہے۔ اِن چیزوں کو اس ملک کے تمول کے ساتھ مدِّنظر رکھکر قیمتوں کی یہ گرانی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ اِن ذریعوں سے یہ لوگ ہر جنس کی عمدہ نسل بڑھانے کی تدابیر کرتے رہتے ہیں۔ اور تجربہ کرتے ہیں کہ کون سی جنس کس درجے کی ترقی کی قابلیت رکھتی ہے۔

رضی الدین احمد (لنڈن)

دُرِّ بے بہا۔ مولوی حکیم محمد علی مرزا بیگ صاحب رسول شاہی نے اِن اعتراضات کے جواب میں جو غیر مذہب والے اسلام پر کرتے ہیں یہ کتاب نہایت محنت سے تصنیف فرمائی ہے مصنف کی خوش نویسی نے کتاب کی وقعت کو دوبالا کر دیا ہے امید ہے کہ قوم میں کتاب وقعت سے دیکھی جائیگی اور مرزا صاحب مصنف کی محنت کی داد ملیگی۔ قیمت ۸ر

خواجہ فضل احمد صاحب شیدا اسسٹنٹ سکرٹری انجمن اخوان الصفا۔ کوچہ چیلان دہلی سے مل سکتی ہے

افراد اور اقوام

خداوند روزگار کی معینہ و مقررہ عادت ہے کہ وہ اُن کی مدد و دستگیری فرماتا ہے جو خود آپ اپنی مدد و دستگیری کیا کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا قول و اقرار ہے جو جتنی طرح معرض امتحان و آزمائش میں آچکا ہے۔ بقول ایک چھوٹے سے کمپاس میں اپنی وسیع معانی و مفاہیم کے دریا کو گھیرے ہوئے ہے۔

اپنی مدد آپ کرنے کا ارادہ انسان کی ترقی و عروج کی فی نفسہ خالص بنیاد ہے (جیسا کہ عنقریب صدہا مشہور لوگوں کے سوانحات عمری کی داستانوں سے ثابت ہوگا) اور یہی قوموں کی سرسبزی و تقویت کا اصل ذریعہ ہے۔ بیرونی مدد کا اثر عموماً کمزور و ناتواں ہوا کرتا ہے جبکہ اندرونی اعانت بہت کچھ تر و تازہ و شاداب بناتی ہے جو کچھ دوسروں کے واسطے کیا جاتا ہے اس میں ایک حد تک اُنکی مستعدی شامل نہیں ہوتی جس قدر کہ اپنی ضروریاتِ زندگی کے تہیّہ کی طرف میلان خاطر ہوا کرتا ہے۔

جہاں کہیں لوگوں کو ماتحتی برداشت کرنی پڑتی ہے وہاں خواہ مخواہ معذوری و مجبوری سے سابقہ ہوتا ہے۔ عمدہ رسم و رواج انسان کو عملی مدد یا اعانت نہیں پہنچا سکتے۔ ہاں اگر وہ اپنی حالت پر چھوڑ دیئے جائیں تو امید ہے کہ ترقی سے ہمدوش ہوکر حالتِ شخصی کو بلند پرواز کرسکتے ہیں۔ ہر زمانہ میں لوگوں کا اعتقاد یہ ہوتا ہے کہ اُنکی آسائشیں اُنکی مسرتیں محض رسم و رواج یا عمدہ قوانین پر منحصر ہیں۔ حالانکہ یہ اعتقاد درست نہیں ہے بلکہ اپنے ذاتی چال چلن کی عام تندرستی اور خصلتوں کی خوبی پر اس مقصد کا انحصار ہوا کرتا ہے۔ قوانین امن عامہ و حفاظتِ جان و مال پر موثر ہوا کرتے ہیں اور جب قابلیت کے ساتھ وضع کئے جاتے ہیں تو انسان کے اخلاق و محبت

کی درستی کے نتائج پیدا کرتے ہیں گو وہ نتائج روحانی ہوں یا جسمانی۔ لیکن یاد رہے
کہ کوئی قانون خواہ کیسا ہی سخت ہو۔ کاہل کو محنتی۔ فضول خرچ کو کفایت پسند۔ شرابی
کو محتاط نہیں بنا سکتا۔ ان عیوب کی اصلاح صرف شخصی افعال کو بناء درست کرنے سے
حاصل ہو سکتی ہے۔ کفایت پسندی و نفس کشی عمدہ عادتوں کا سرمایہ ہیں نہ کہ قوانین یا
ہدایات کا نتیجہ۔

قوموں کا مجموعی چال چلن قدرتی قانون میں اپنا مناسب استقرار طرح پیدا
کر لیتا ہے جیسے پانی اپنی سطح ڈھونڈھ لیا کرتا ہے۔

دنیا میں شریف النفس اقوام پر شرافت کے اصول ملحوظ رکھ کر حکمرانی ہوتی ہے۔ و
ذلیل و کمینوں پر کمینہ پن سے حکومت انکی کیجاتی ہے۔

بلاشبہ تمام تجربے اس ثبوت کے موید ہیں کہ ایک سلطنت کی قوت و قدرت
ہی مراکم کی ماتحت ہے۔ قومیں انسان کا مجموعہ ہیں اور افعال کی شائستگی خصلتوں کی
تہذیب شخصی سرفرازی کا نام ہے (اس میں چاہے مرد ہوں یا عورتیں بچے ہوں یا
بوڑھے کیونکہ سوسائٹی انہی افراد سے مرکب ہے) قومی ترقی۔ شخصی محنت۔ اولوالعزمی
ایمانداری و سچائی کا نتیجہ ہے جبکہ قومی تنزل شخصی کاہلی۔ شخصی خود غرضی و ابتری
کا خاص سبب ہے۔

ہم اُن اخلاقی کمزوری و برائی پر جو انسان کی گمراہی سے پیدا ہوتی ہو اشکبار
ہوتے ہیں ہوا کریں۔ یہ ابتریاں قانون کی سختی یا احکام کے اجرا سے دفع نہیں
ہو سکتیں اور اگر ہو بھی جائیں تو وہ دوسری شکلوں میں پھر زندہ و بیدار ہونگی تاوقتیکہ
ذاتی چال چلن درست و ہموار نہ کیا جائیگا۔ اگر ذاتی افعال کی درستی کا رجحان اتنی
پر ہے تو ہمدردی نوع انسان کا اعلیٰ ترین استحقاق و منصب حاصل ہے اور انسان کی
شخصی عادات و صفات کو تربیت کرنے اور آزادانہ طور سے انکی حالت درست

کرنے کا یہ عمدہ وسیلہ ہو ورنہ کچھ نہیں۔

سب سے بڑی غلامی شخصی حکومت کی ماتحتی ہے۔ لیکن اس سے بھی بدتر غلامی ذاتی بداخلاقیوں اور خود غرضیوں کی اسیری ہے۔

جو قومیں ذل کی غلامی میں گرفتار ہیں وہ فرمانرواؤں یا قوانین کے حسب دلخواہ تغیر و تبدل سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتیں۔

اصلی آزادی شخصی عادات و اطوار کی سلامت روی ہے اور یہی سلامت روی قومی و جمہوری ترقی و معراج کی بنیاد ہے۔

جان اسٹوارٹ مل نے سچ کہا ہے کہ "شاہی مظالم یا سختیاں اسقدر خراب تاثیریں نہیں رکھتیں جتنی کہ افراد خود اپنے دونوں ہاتھوں سے مہیا و اکٹھا کرتے ہیں۔ کوئی قیصر کے لئے کوئی شریف کے لئے کوئی ایکٹ پارلیمنٹ کے لئے گریہ زاری کرتا ہے۔ ہم کو اختیار ہو کہ کسی نیک نفس قیصر کا انتظار کریں۔ لیکن قیصر کی آؤبھگت انسانی پرستش کی نہایت ذلیل حالت ہوگی۔ جس کے معنے یہ ہوئے کہ اختیارات کی عبادت کیجائے یا دولت کے سامنے دوزانو ہوں۔ سب سے زیادہ تاکیدی اور پرحجت سبق یہ ہو کہ اپنی مدد آپ کرو۔ عملی طور سے کچھ کر دکھاؤ۔ اور جب اس نمائشگاہ میں کامیاب ہو جاؤ گے تو نہ قیصر و فغفور کی نہ شریف و شرافت کی نہ ایکٹ پارلیمنٹ کی آرزو یا پرواہ ہوگی بلکہ یہ چیزیں خود تمہاری پرواہ و تمنا کریں گی۔

دو اصول ایک دوسرے کے براہ راست دشمن و حریف ہیں۔ جن کی صراحت وکٹر ہیگو نے یہ کی ہے کہ "قلم اور تلوار" یعنی قلم تلوار کو توڑ ڈالتا ہے۔

ثابت قدمی بھی کامیابی کے لئے اعلیٰ درجہ کا ایجنٹ ہو جو کچھ ہم اختیار کریں سرگرمی و دھن کے ساتھ اگر اختیار کرینگے تو کانشنس کے اعتبار پر کہا جاتا ہے کہ

بہت جلد اعلیٰ سے اعلیٰ آزادیاں بہ نسبت دوسری قوموں کے ہم کو حاصل ہونگی۔ لینڈ کے ایک سچے محب وطن نے ڈبلن انڈسٹریل نمائشگاہ کے افتتاح کے وقت پیمار کہا تھا کہ تمام قومیں جو آج سرسبز و خوشحال دکھائی دیتی ہیں صرف محنت کرنے سے ان کی بنیاد درست ہوئی ہے۔ زندگی کے تمام مدارج میں صبر و ثابت قدمی سے محنت کرنا ایسی ضروری شے ہے جس کے مقابلہ میں کوئی چیز قابل تقلید نہیں ہے۔ کاشتکاری۔ زمینداری نقش معدنیات و نباتات صناعی و انکشافات۔ انجینری و ایجاد فلاسفی و شاعری ادب و انشا پردازی غرض کوئی فن کوئی ہنر بغیر محنت کے کبھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ ایک نسل کی عمارت دوسری نسل پر بنا کرتی ہے۔ ہم کاروبار ہی کے شریف ورثا ہیں جنہوں نے ترقی و تہذیب میں نہ صرف عمدگی و بانکپن پیدا کیا ہے بلکہ اس عالم ہیولا میں سائنس و ہنرمندی کی بڑی بھاری خدمت انجام دی ہے۔ خود مدد کرنیکا اصول جیسا کہ انسان کے سرگرم و کامیاب کاموں میں شریک نظر آتا ہے وہ بخوبی ظاہر ہے۔ لیکن علی الخصوص انگریزی قوم کے چال چلن میں یہ اصول صاف نمایاں ہے۔ اس پر غور کرنے سے ہماری قوت و وجاہت کا صحیح پیمانہ محسوس ہوتا ہے۔ اس کتاب میں سلسلہ وار ایسی تصویریں چسپاں ہیں جو سربلند نظر آتی ہیں اور جو دوسروں سے فوراً علیحدہ کر لی جاسکتی ہیں۔ اگرچہ تمام فوج میں جو میدان جنگ میں حریف کے مقابل اپنے سروں کو ٹیک دیتی اور جان نثار کرتی ہے صرف جنرل کی نام و نمود ہوتی ہے۔ حالانکہ ہر ایک سپاہی کے جوش عزم سے وہ کامیابی و فتحیابی حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح زندگی خود ایک سپاہیانہ جنگ و جدل ہے۔ مرتبے و عزت والے بڑے بڑے لوگ معمولی کاروباریوں اور محنتیوں کے طبقہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ ہر چند بہت سے لوگوں کی سوانح عمریاں اس لئے ضبط تحریر میں نہیں آئیں کہ وہ کسی اعلیٰ مرتبہ یا قسمت کے مالک نہ تھے اور وہ

عوام الناس میں داخل تھے۔ بڑے بڑے حضرات تک ہماری دلچسپی محدود ہے حالانکہ جس طرح ایک بڑے آدمی کی سوانح عمری و تجربات زندگی دلچسپ ہوسکتے ہیں اسی طرح ایک معمولی آدمی کے تجربے فائدہ رساں ثابت ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ معمولی و کم حیثیت آدمی بھی جس نے اپنے ہمعصروں کے سامنے اپنی محنت اپنی ایمانداری اپنے استقلال کی واضح مثال چھوڑی اور اپنے جوہر قابلیت کا دوسروں پر اثر پیدا کیا۔ اسی طرح سرفرازی و اعزاز کا مستحق ہے جیسے کہ اعلیٰ مرتبت لوگوں نے ان صفات کو شائع کیا۔

روزمرہ کے تجربے اس دعویٰ کا بیّن و بدیہی ثبوت ہیں کہ افراد کی مستعدی و محنت کا دوسروں کی رفتار زندگی پر نہایت زوردار و زبردست اثر ہوتا ہے۔ اور حقیقت میں یہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہے جو روزمرہ دنیا کی شاہراہوں اور گذرگاہوں میں حاصل ہوتی ہے۔

کالج اسکول درسگاہیں ابتدائی تربیت کے باقاعدہ کرنے کے لئے ضروری ہیں نہ حصول تجربے کے لئے لازمی۔ اصلی تعلیم دوکانوں پر ملتی کارخانوں میں بنج بیوپار میں نصیب ہوتی۔ صرافہ میں دکھائی دیتی ہے۔ الغرض انسان کی تمام مشغول آمدرفت میں اس کا پتہ چلتا ہے۔ یہ تعلیم انسانی خصائل کو راہ راست پر لاتی اور اس قابل بناتی ہے کہ کاروبار دنیا میں صحیح فرائض اور ذمہ داریوں کی تعمیل کرائے۔ اس قسم کی تعلیم محض کتابوں کے پڑھنے سے نہیں آتی اور نہ علم ادب کی مہارت اس تعلیم کو مکمل کرسکتی ہے۔ بیکن نے خوب کہا ہے کہ تعلیم اپنا استعمال نہیں بتاتی۔ یہ عقل ہے جو تعلیم کا فائدہ سکھاتی ہے۔ اور یہ محض بصیرت سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا پختہ ریمارک ہے جو سچی زندگی کی تصویر کھینچتا ہے۔ تمام تجربے اور مشاہدے اس سبق کے سیکھنے پر مجبور کرتے ہیں کہ ایک

عرصہ دراز سے سوتی تھیں انہیں انہیں پریشانیوں کے ہجوم نے بیدار کر دیا۔ آخر کار یہ مزاحمتیں اور رکاوٹیں مغلوب و سرنگوں ہو گئیں۔ اور فتحیابی نصیب ہوئی اور یہ مثل صادق آئی کہ"

دُھن اور کوشش کے ساتھ انسان زمین کو آسمان بنا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر بزرگ شیکسپیئر کو دیکھو۔ وہ ایک حجام کی دکان سے نکلا اور اپنی محنت۔ اپنی ذہانت و قابلیت کے عمدہ استعمال اور ہمت کے شاعرانہ بلند مرتبہ پہنچ میں کس خوبی کے ساتھ دیکھا گیا۔

رچرڈ آرکرائٹ موجد مشین پارچہ بافی۔ لارڈ ٹنٹرڈون منتخب روزگار چیف جسٹس ٹرنر دنیا کا صحیح و بے مثل نقشہ کش۔ یہ سب پہلے نہایت بے حیثیت گمنام و نشان لوگ تھے۔ اسی طرح کوئی نہیں کہہ سکتا کہ شیکسپیئر کیا تھا لیکن اس میں مطلق کلام نہیں، کہ وہ ایک نہایت غریب ماں کے گھر پیدا ہوا اُس کا باپ گلہ بان بھی تھا قصاب بھی تھا۔ شیکسپیئر خود اپنی ابتدائی جوانی میں اس قسم کی رذیل خدمتیں انجام دیتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اون بھی بناتا تھا جبکہ بعض مدعی ہیں کہ وہ ایک اسکول میں ملازم تھا پھر محرر ہوا۔ بلاشبہ اتنی بات تو ضرور ہے کہ وہ بہت سے آدمیوں کا مجموعہ تھا کیونکہ اس کے سمندر کے سفرنامے اور بحری تجربات کو پڑھ کر بعض بحری سیاح یہ رائے رکھتے ہیں کہ وہ ضرور ملاح رہا ہے۔ جبکہ ایک واعظ یہ کہتا ہے کہ اس کی تحریر شاہد ہے کہ وہ یقینی واعظ یا کسی واعظ کا ہمنشست رہا ہے۔ گھوڑوں کے سوداگر اور معتبر تاجر معترف ہیں کہ اس نے ضرور کبھی گھوڑوں کی تجارت بھی کی ہے۔ اس دنیا کے تھیٹر میں بلاشبہ شکسپیئر ایک عجیب و غریب ایکٹر تھا۔ جس نے اپنی زندگی میں مختلف روپ بھرے اور ان سب میں بلا تفرقہ و تردد کامیاب ہوا۔ وہ تمام عمر علوم و فنون کی وسیع دنیا سے تجربے اکٹھے کرتا رہا۔ بہرحال میں وہ ایک پکا طالب علم سخت

جفاکش تھا۔ دیباکہ اُس کی تحریریں اس زمانہ میں قوی اثر سے دست بگریبان اور انگریزی قوم کے چال چلن کا صحیح عنوان بتانے میں نہایت کامیاب سبق ہیں۔ مزدوری کرنے والوں میں برنڈلی انجنیر۔ کوک ملاح۔ برنز بے مثل شاعر پیدا ہوئے۔ بن جانسن کی وجہ سے لندن کی مشہور عمارات۔ لیکن ان اور تین کی انیٹں اگر فخر کریں تو بجا ہے جس کے ایک ہاتھ میں معماروں کی طرح تھاپی اور دوسرے ہاتھ میں کتاب رہتی تھی۔

ایڈورڈ ٹلفورڈ۔ انجنیر۔ ہگ ملر۔ سیاح۔ کننگھم مشہور سنگتراش و انشاپرداز۔ سیکو جیمیس بنت کار۔ رامنی۔ واٹ دلیمی مشہور مصور۔ جان گبسن۔ چھوٹی چھوٹی گمنام حالت سے ذی مرتبہ وعظیم الشان ہوئے۔

اسن میں سمن ریاضی کا عالم متبحر۔ بیکن اوم واکر جان فاسٹر بڑے فلسفی مصنف و انشاپرداز ثابت ہوئے۔ ولسن مصنف کتاب تذکرۃ الطیور۔ واکٹر لونگ اسٹون اور بٹن ہل شاعر ان سب نے چھوٹی حالت سے ترقی و اقبال کی شاہراہ دیکھی۔

سر کلو ڈس شول بڑا بھاری امیر البحر پہلے جوتے ٹانکتا تھا۔ سیموئل وٹلور۔ ایک بڑا فلسفی۔ مسٹر گفرڈ۔ کوارٹرلی ریویو لندن کے ایک سرآوردہ و مشہور اخبار کا اڈیٹر ولیم کیری۔ مشہور مشنری۔ یہ سب پرانے جوتے مرمت کیا کرتے تھے۔ چند سال ہوئے تھامس اوورڈ ایک ماہر کامل علم طبعیات بھی پہلے جوتے ٹانکا کرتا تھا۔ جس نے اس پست پیشہ وری کے اوقات فرصت میں علم طبیعات کو پڑھنا اور سیکھنا شروع کیا اور اس مشکل علم کی تمام اہم شاخوں پر عبور حاصل کر لیا۔ منجملہ اس کے تجربات کے ایک دوا کا نام اددر دی ہے جس پر اُسے خلعت و انعام مرحمت ہوئے اور اُس کی شہرت نے امیر بنا دیا۔

جان اسٹو خیاط تھا۔ اب بڑا بھاری مورخ مانا جاتا ہے۔ یہ شخص اپنی عمر کے اکثر حصوں میں ایک چھوٹا تاجر بھی رہا تھا۔ جیکسن مصور بھی کپڑے سیا کرتا تھا۔

سر جان ہاک ہڑ جسکے اعزاز و سربلندی کی یہ حالت ہو کہ شاہ اڈورڈ سوئم شہنشاہ انگلستان نے اُسے نائٹ کا خطاب مرحمت کیا۔ حالانکہ فی الواقع یہ خطاب اسکی جرأت و بہادری کا مختصر صلہ تھا۔ یہ پہلے ایک درزی کی دوکان پر نوکر تھا۔ ہاپس امیر البحر بھی پہلے خیاط تھا۔ اور ایک درزی کے یہاں نوکر تھا۔ ایک نیا جہاز ایک جزیرہ کو جا رہا تھا۔ اس گاؤں کے ساحل پر جہاں یہ ملازم تھا اس جہاز نے لنگر کیا۔ یہ لڑکا اپنے ہمسن رفقا کے ساتھ اس جہاز کا تماشا دیکھنے کے لئے دوڑا۔ اس عظیم الشان منظر جہاز رانی کو دیکھکر اس کے دل میں یکایک بحری سفر کا ولولہ پیدا ہوا۔ اور فوراً ایک کشتی پر سوار ہو کر جہاز ران سے ملا۔ اور اسکی خواہش بحیثیت والنٹیر اس کی خدمت قبول کر لی گئی۔ چند سال بعد وہ اپنے وطن مالوف کو بیحد اعزاز اور دولت ساتھ لیکر واپس آیا۔ اور اس نے خوشگوار و لذیذ قیمتی و نفیس کھانے اپنی اسی جھونپڑی میں بیٹھ کر کھائے جہاں اُس نے درزی کی نوکری کی خدمت ادا کی تھی ؏

سید عطا حسین

فلسفہ ازدواج (جسکا ماخذ ایک امریکن مصنف کی مشہور کتاب ٹ ٹ اے ینگ مین اوٹ ٹو نو ہے) مولوی سید علی صغر صاحب بلگرامی نے نہایت محنت و قابلیت سے لکھی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ معاشرت پر بہت اچھا اثر پیدا کریگا اور متاہل اشخاص کیواسطے آئندہ زندگی میں سچا رہنما ہوگا۔ سید صاحب کی اس تصنیف نے اردو لٹریچر میں ایک بیش قیمت اضافہ کیا ہے اور ہم سید صاحب کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔ قیمت عہ شمسی پریس آگرہ سے مل سکتی ہے ؏

تقویم العرب قبل الاسلام

اسلام سے پہلے کی تقویم عرب کے حالات قریب قریب تمام اسلامی تاریخوں میں ملتے ہیں لیکن ابوریحان البیرونی المتوفی ۴۳۹ھ نے ان مباحث کو اپنی کتاب الآثار الباقیہ فی قرون الخالیہ میں نہایت تفصیل سے لکھا ہے اس کی کتاب دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان مباحث میں عرصہ تک مصروف رہا ہے اور ہر ایک بات کی خوب چھان بین کی ہے۔ اس لئے اس بارے میں اس کے بیانات بہ نسبت دیگر مصنفین کے زیادہ معتبر اور قابل وثوق ہیں۔

اس مضمون کا بیشتر حصہ آثار الباقیہ سے ماخوذ ہے۔ علاوہ اس کے حسب ذیل کتابوں سے بھی مدد لیگئی ہے۔

(۱) مروج الذہب لامام ابوالحسن المسعودی المتوفی ۳۴۶ھ

(۲) الملل والنحل للامام عبدالکریم الشہرستانی المتوفی ۵۴۸ھ

(۳) صناجۃ العرب فی تقدمات العرب۔ لنوفل آفندی بن نوفل۔

۱ — عرب میں اسلام سے پہلے کا زمانہ "زمانۂ جاہلیت" کہلاتا ہے۔ اس زمانہ میں قوم عرب پر جہالت چھائی ہوئی تھی۔ اُن کے دل و دماغ ہر قسم کے افکار و آلام سے آزاد تھے۔ لوٹ مار جنگ و جدل میں اُن کی عمریں بسر ہوتی تھیں۔ تمدنی مشاغل سے اُن کو کسی قسم کا تعلق نہ تھا۔ ان کی زندگی بالکل وحشیانہ تھی۔

ان لوگوں میں اپنے واقعات یادرکھنے اور معاملات لین دین کے لئے کوئی زمانہ مقرر نہ تھا۔ البتہ اتنا ہوتا تھا کہ سال بسال کے واقعات کے واسطے انہوں نے

ستارے مقرر کر لئے تھے جن کے طلوع پر معلوم کر لیتے تھے کہ فلاں واقعہ کو ایک سال ہوا مثلاً کسی کا کچھ لینے دینے کا واقعہ ہے تو اس کا وقت کسی ستارے کے طلوع پر مقرر کیا گیا ہے۔ جب ستارہ طلوع کرے گا اسوقت سمجھا جائیگا کہ معاملہ مذکور کا وقت آگیا۔

مشرقی ساحل یا حجاز کے باشندے تجارت پیشہ تھے جس کی وجہ سے ان کو رومیوں مصریوں مجوسیوں وغیرہ متمدن اقوام سے میل جول کا بارہا موقع ملتا تھا۔ سوائے اس کے ان کے ملک میں شام کے یہودیوں نے آکر سکونت اختیار کرلی تھی جنہیں بخت نصر ۵۸۸ق م نے یروشلیم سے نکالدیا تھا۔ اور دوسری صدی مسیحی میں بہت سے عیسائی قبایل بھی دولت روما کے ظلم وستم سے تنگ آکر یہاں آباد ہوگئے تھے۔ ان اقوام کے اثرات سے عربوں میں زمانے کے تعین کی تحریک پیدا ہوگئی تھی۔ اور انہوں نے اپنے کئی ایک مشہور حوادث کو اپنے واقعات یاد رکھنے کے لئے مقرر کر لیا تھا۔ اہل حجاز خصوصاً ساکنین مکہ میں ذیل کے تین مدت زمانیہ کا زیادہ تر رواج تھا۔

(۱) ایک حساب کعب بن لوئی کے انتقال سے شروع ہوا تھا۔

(۲) دوسرا واقعہ اصحاب الفیل سے۔

(۳) تیسرا تعمیر کعبہ سے۔

ان لوگوں نے جب واقعہ اصحاب الفیل سے حساب شروع کیا تو گذشتہ سالوں کو چھوڑدیا۔ اسی طرح بنائے کعبہ سے پھر ان کا حساب از سرنو نیا ہوگیا۔ یہانتک کہ مسلمانوں نے سنہ ہجری کو جاری کیا۔

اصحاب الفیل کے مکہ میں آنے کے چالیس دن بعد جناب رسالتماب تولد ہوئے[۱] اسوقت کسریٰ نوشیرواں کا چالیسواں سنہ جلوس تھا[۲]۔ کسریٰ سنہ میں تخت نشین ہوا[۳]

اس حساب سے ولادت کا زمانہ ۵۷۱ء قرار پایا ہے جس کے رو سے جو زمانہ کہ میں اصحاب الفیل کے آنے کا ثابت ہوا کعب بن لوئی کے انتقال اور واقعہ اصحاب الفیل کے درمیان پانسو برس کا فاصلہ ہے جس کے اعتبار سے ۷۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔ احادیث صحیحہ میں وارد ہے کہ جب رسول خدا ۳۵ سال کے تھے کعبہ کی تعمیر ہوئی۔ پس اس حساب سے یہ واقعہ ۶۰۶ء کا ہے۔

مذکورہ بالا حسابات کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ وفات کعب بن لوئی کے سنہ کا آغاز ۷۱ عیسوی کے مطابق ہے اور واقعہ اصحاب فیل کے سنہ کا آغاز ۵۷۱ء کے مطابق اور تعمیر کعبہ کے سنہ کا آغاز ۶۰۶ء کے مطابق۔ حساب سے متحقق ہے کہ ۶۲۲ء میں جناب رسالتمآب نے ہجرت فرمائی جس کی رو سے تعمیر کعبہ سے ہجرت تک اٹھارہ برس کا زمانہ گذرا ہے۔

۲ - اہل عرب چونکہ بہت سے قبائل میں منقسم تھے۔ اس لئے ان میں مہینوں کے کئی ایک ناموں کا رواج تھا۔ کیونکہ ہر ایک قبیلہ اپنے مہینوں کے علیحدہ علیحدہ نام رکھ لیتا تھا۔

قوم ثمود نے اپنے مہینوں کے حسب ذیل نام رکھے تھے۔ موجب موجر مورد ملزم مصدر ہوبر ہوبل موہا دیمر وابر حیفل مسبل۔ ان ناموں کو عیسیٰ بن یحییٰ مسیحی نے اس طرح منظوم کیا ہے ؎

شہور ثمود موجب ثم موجر   و مورد تیلو ملزما ثم مصدر
وہوبر باقی ثم یتلو ہوبل   وموہا قد یقفوہا ثم دیمر
ووابر یمض ثم یتلو حیفل   ومسبل حتی تم فیہا اشہر

البیرونی نے ابوبکر محمد بن درید الازدی کی کتاب الوشاح کے حوالے سے لکھا ہے کہ موجب سے مراد محرم ہے اور موجر سے صفر اور مورد سے ربیع الاول،

علیٰ ہذا القیاس۔[1]

عرب العاربہ کے قبائل حسب ذیل ناموں کو استعمال کرتے تھے[2] ناتق ثقیل طلیق ناجر اسلح امخ احلک کسع زاہر برط یا مرط حرف نعس۔ یہ ترتیب بلحاظ محرم صفر وغیرہ ہے یعنی ناتق سے مراد محرم ہے اور ثقیل سے صفر علیٰ ہذا القیاس دیگر قبائل نے یہ نام تجویز کرلئے تھے موتمر ناجر خوان صوان بائدہ رنی اصم دغل نائل عادل رنہ برک۔ چنانچہ ان ناموں کو کسی شاعر نے اس طرح نظم کیا ہے ؎

بموتمر و ناجرہ بدانا و بالخوان یتبعہ الصوان

و بارنی و بائدہ یلیتہ بعود اصم صم بالسان

و واغلہ و ناتلہ جمیعاً و عادل فہم عز حسان

و رنہ بعدہا برک فتمتہ شہور الحول یعقدہا النبان

بعض نے ان ناموں کو اس طرح بیان کیا ہے موتمر ناجر خوان صوان حنین رنی اصم داغل ناتق عادل ہواع برک۔ صناجتہ الطرب میں اس طرح لکھے ہوئے ہیں۔ موتمر ناجر خوان صوان ضنم ربا اصم عادل ناتق واغل ہواع برک۔ تسمیہ ثانی میں بائدہ کی بجائے حنین اور نائل کے بجائے ناتق اور رنہ کی بجائے ہواع ہے۔ تسمیہ ثالث میں بائدہ اور حنین کی بجائے ضنم اور رنی کی بجائے ربا ہے پھر سب باہمدیگر متفق ہیں۔

لغت نویسوں نے تصریح کی ہے کہ موتمر سے مراد محرم ہے اسی طرح ناجر سے صفر اور خوان سے ربیع الاول صوان سے ربیع الثانی۔ بائدہ سے جمادی الاول۔ رنی سے جمادی الآخر۔ اصم سے رجب۔ عادل سے شوال۔ واغل سے شعبان نائل سے رمضان۔ رنہ سے ذیقعدہ برک سے ذی الحجہ اور یہ بھی صراحت کی ہے کہ حنین

وضنم سے جمادی الاوّل ناتق سے رمضان - ہوع سے ذی القعدہ رنا سے جمادی کے دونوں مہینے مراد ہیں - اس مطابقت کی تائید مشہور شاعر اسمٰعیل بن عباد کے ایک قطعہ سے بھی ہوتی ہے ؎

اروت الشہور العرب فی الجاہلیۃ	فخذ ہا علی السرد والحرم تشترک
فموتمر یاتی ومن بعد ناجر	وخوان وصوان تبتع فی شرک
حنین و رنی والاصم و عادل	و ناتق مع وعل ورنہ مع برک

قبائل قریش اور اہل مکہ ان ناموں کو استعمال کرتے تھے جنہیں اب ہم استعمال کرتے ہیں - یعنی محرم صفر ربیع الاوّل ربیع الثانی جمادی الاوّل جمادی الثانی رجب شعبان رمضان شوال ذی القعدہ ذی الحجہ یہ نام کلوب بن مرہ کے زمانہ میں وضع کئے گئے ہیں - یہ واقعہ ظہور اسلام سے قریباً ساڑھے تین صدی پہلے کا ہے[۱]

عربوں نے اپنے مہینوں کو فصول اربعہ پر منقسم کر رکھا تھا - وہ لوگ موسم کو خریف سے شروع کرتے تھے جسکو ربیع کہتے تھے اس کے بعد سرما اور ربیع کی فصل ہوتی تھی جس کو وہ لوگ صیف کہتے تھے - پھر فصل گرما آتی تھی جسکو قیظیہ کہتے تھے[۲]

عربوں نے مہینوں کے نام اُن حالات اور مناسبتوں کے لحاظ سے رکھے تھے جو اُن مہینوں میں واقع ہوتے تھے - رجب ذی القعدہ ذی الحجہ محرم ماہ محرمات سے تھے - ان کو وہ لوگ اشہر الحرم کہتے تھے - اور ان ایام میں جنگ وجدل لڑائی جھگڑوں کو چھوڑ دیتے تھے

محرم کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ مہینہ منجملہ چار ماہ حرام کے تھا -

صفر کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس مہینے میں عربوں کو ایک موسمی مرض لاحق ہوتا تھا - جس سے اُنکے رنگ زرد ہو جاتے تھے -

ربیع الاول و ربیع الثانی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ مہینے فصل خریف میں واقع ہوتے تھے جسے اہل عرب ربیع کہتے تھے۔

جمادی الاول جمادی الثانی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ مہینے موسم سرما میں آتے تھے جبکہ برف پڑنے لگتی تھی اور پانی جم جاتا تھا۔

رجب میں اہل عرب جنگ و جدل چھوڑ دیتے تھے۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ لوگ کہتے تھے ارجبوا یعنی جنگ و جدل سے باز رہو۔

شعبان کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ لوگ اس مہینے میں لوٹ مار کے لئے متفرق ہو جاتے تھے۔

رمضان کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ مہینہ اوائل موسم گرما میں آتا تھا جبکہ زمین تپنی شروع ہوتی تھی۔ جاہل عرب بھی انکو متبرک مہینہ سمجھتے تھے۔

شوال کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اہل عرب اس مہینہ میں لڑائیوں پر جایا کرتے تھے اور کہتے تھے شولوا یعنی کوچ کرو۔ بعض کہتے ہیں کہ شوال کے معنے ہیں اونٹنی کا نر کے پاس جانا۔ چونکہ اس مہینے میں اونٹنیاں خواہش نفسانی سے مغلوب بہت ہوکر نروں کے پاس جاتی تھیں اسوجہ سے اس کا نام شوال رکھا گیا۔

ذی القعدہ۔ اس مہینے میں جنگ و جدل چھوڑ دیتے تھے۔

ذی الحجہ۔ اس مہینے میں حج کرتے تھے۔[۱]

مورخین ثمود اور عرب العاربہ وغیرہ کے مہینوں کی وجہ تسمیہ بھی بیان کی ہے چونکہ وہ تمام اقوال ایک دوسرے کے خلاف اور واقعات مناسبتوں کے متناقض ہیں اس لئے انکا ذکر فرو گذاشت کر دیا گیا۔

۳۔ جاہلین عرب جمعہ کو عروبہ کہتے تھے شنبہ کو شیار۔ یکشنبہ کو اول۔

دوشنبہ کو اہون ۔ سہ شنبہ کو جبار ۔ چہارشنبہ کو دبار ۔ پنجشنبہ کو مونس ۔ کسی جاہلی شاعر نے اِن ناموں کو اِس طرح منظوم کیا ہے ۔

علمت بان اموتی و ان موتی　　باوهد اور باهون اوجبار
اوالتالی دبار او بیوفی　　بمونس او عروبة او مشیار

بعض یورپین مصنفوں کا خیال ہے کہ جاہلی عرب تقسیم ساعات کے بارے میں بالکل ناواقف تھے ۔ لیکن یہ اُن کی صریح غلطی ہے ۔ ان میں عام رواج کے موافق دِن رات کی تقسیم ۲۴ ساعت پر تھی ۔

رات کی پہلی ساعت کو ناشیۃ اللیل اور شفق کہتے تھے ۔ دُوسری کو عشوہ ۔ تیسری کو غسق ۔ چوتھی کو ہداۃ ۔ پانچویں کو شروع ۔ چھٹی کو جنح ۔ ساتویں کو زلفہ ۔ آٹھویں کو ہزیع ۔ نویں کو عبس ۔ دسویں کو سحر ۔ گیارھویں کو فجر ۔ بارھویں کو صبح ۔
اِسی طرح دِن کی پہلی ساعت کو بکور ۔ دُوسری کو بزوع ۔ تیسری کو رأد ۔ چوتھی کو ضحی ۔ پانچویں کو متوع ۔ چھٹی کو ظہیرہ ۔ ساتویں کو زوال یا موہاجرہ ۔ آٹھویں کو اصیل ۔ نویں کو عصر ۔ دسویں کو طفل ۔ گیارھویں حرور ۔ بارھویں کو غروب[1] ۔

۴ ۔ جاہلی عرب سنہ قمری کا استعمال کرتے تھے اور اپنے مہینوں کو فصول اربعہ پر تقسیم کرتے تھے ۔ شمسی قمری سال کے گھٹاؤ بڑھاؤ کی وجہ سے مہینوں کی یہ خصوصیت تھوڑے ہی عرصہ میں موقوف ہو گئی اور وُہ مختلف فصول پر پھیل گئے ۔ یعنی سردی کے مہینے گرمی میں اور گرمی کے سردی میں آنے لگے تو اُنہوں نے اس تفرقہ کو رفع کرنے کے لئے طریق کبیسہ کو اختیار کیا ۔ اس طرح پر کہ دورہ قمری کے بارہ مہینوں میں کبھی تیرھواں مہینہ اضافہ کرکے قمری سال کو شمسی سال بنا لیتے تھے ۔ جس سے اُن کے مہینے یکساں اِسی اوقاتِ معیّنہ پر قائم رہتے تھے ۔ نہ آگے ہوتے اور نہ پیچھے ہوتے تھے ۔ اس طریقہ کو وُہ لوگ نسئی کہتے تھے ۔ ایک

جاہلی شاعر اس کا اس طرح ذکر کرتا ہے -

مابین دور الشمس والهلال یجمعه جمعا لذی الاجمال

حتی یتم الشهر بالکمال

تمام مؤرخین اس بارے میں متفق ہیں کہ عربوں میں کبلیسہ کا رواج تھا لیکن زیادتی کیفیت میں اختلاف ہے - البیرونی کا بیان ہے کہ ۲۴ سال گذرنے کے بعد نو مہینے بڑھا دیتے تھے[۵۱] مسعودی اور شہرستانی کے تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر تیسرے برس ایک مہینہ اضافہ کرتے تھے[۵۲] قمری سال ۳۵۴ یوم کا اور شمسی سال ۳۶۵ یوم ۵ ساعت ۴۸ دقیقہ ۴۹ ثانیہ کا ہوتا ہے - بہ لحاظ کثرات کے قمری سال میں ۱۱ ¼ یوم کی کمی ہوتی ہے - چونکہ اس کسر سے ۳ سال میں صرف ۳۰ یوم کی تلافی ہوتی ہے - اور پونے چار یوم کی کسر باقی رہ جاتی تھی اور ایک عرصہ کے بعد جب یہ کسور جمع ہو جاتیں ہ کوئی مہینہ فصل اربعہ سے کسی فصل سے مقدم ہو جاتا تھا تو اس فرق کے رفع کرنے کے لئے اس سال کو دوبارہ کبلیسہ کرتے تھے[۵۳]

کبلیسہ کے طریقہ کو عربوں نے اسلام سے تقریباً دو صدی قبل یہودیوں سے سیکھا تھا[۵۴] کبلیسہ کی تکمیل قبیلہ قلاس سے مخصوص تھی - یہ لوگ کنانہ کی اولاد سے تھے - اور نسات کہلاتے تھے -

مسعودی کا بیان ہے کہ کبلیسہ کو سب سے پہلے قلمس بن حذیفہ بن عبید نے اختیار کیا اسکے بعد اس کا بیٹا قلمیع بن حذیفہ ہوا اسی کے زمانے میں اسلام کا ظہور رہوا ہے اور سب سے آخر میں ابو ثمامہ ہوا ہے[۵۵] البیرونی کا بیان ہے کہ سب سے پہلا شخص جس نے نسات کیا وہ حذیفہ بن عبد فقیم بن عدی بن ثعلبہ بن

---

[۵۱] آثار الباقیہ ص۱۲ و ص۲۴۲ [۵۲] مروج الذہب جلد اول ص۲۰۱ ملل ونحل طبع یسب [۵۳] آثار الباقیہ ص۲۴۲ [۵۴] آثار الباقیہ ص۳۲۵ [۵۵] مروج الذہب جلد اول ص۲۰۱ +

مالک بن کنانہ تھا اور سب سے اخیر کا شخص جس نے سنات کیا ابوثمامہ جنادہ بن عوف بن امیہ بن قلعہ بن عباد بن فقیح بن حذیفہ تھا [۵۱]

یہ لوگ ایام حج میں نسی کرتے تھے اور نسی کرنے کا یہ طریقہ تھا کہ نسات حج کے مجمع عام میں خطبہ پڑھتا جس میں وہ ایک مہینہ کو نسی کر دیتا اور اس کے بعد کے مہینے کو اس کا قائم مقام کر دیتا۔ پہلا نسی محرم کے مہینے میں واقع ہوتا تھا تو اس کا نام صفر رکھ دیا جاتا تھا۔ پھر ربیع الاول کو بھی صفر کہتے تھے۔ اسکے بعد سب مہینوں کے نام یکے بعد دیگرے شمار کرتے تھے۔ دوسرا نسی صفر میں واقع ہوتا تھا تو اس کے بعد کے مہینے کو بھی صفر کہتے تھے۔ اسی طرح بارہ مہینوں میں نسی دورہ کرتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ پھر محرم پر لوٹ آتا تھا۔

یہ طریقہ عربوں میں ظہور اسلام کے بعد بھی ایام حجۃ الوداع سنہ ۱۰ھ تک رائج رہا۔ اس زمانہ میں جناب رسالتمآب پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اِنَّمَا النَّسِیْ زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ یُضَلُّ بِہِ الَّذِیْ کَفَرُوْا یُحِلُّوْنَھَا عَامًا وَّیُحَرِّمُوْنَ عَامًا یعنی نسی کفر کی زیادتی ہے اس سے کافر گمراہ ہوتے ہیں۔ ایک سال کو حلال کرتے ہیں اور ایک سال کو حرام کرتے ہیں جس کی بنا پر آپ نے ادائے حج کے بعد بمقام منا ایک فصیح و بلیغ خطبہ سنایا اور اس میں فرمایا کہ آگاہ ہو جاؤ کہ زمانہ اپنی اس ہیئت پر پلٹ گیا جیسا کہ اوس دن تھا جس دن خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا [۵۳] اور اس کے بعد وہ آیت سنا کر آپ نے نسی کی تحریم فرما دی [۵۴]۔

حکیم سید شمس اللہ قادری

---

۵۲ آثار الباقیہ صفحہ ۱۲ ۵۳ یہ خطبہ امام بخاری کے جامع صحیح باب حجۃ الوداع و باب الخطبہ کتاب الحج میں مندرج ہے۔ دیکھو جلد اول مطبوعہ مصطفائی صفحہ ۱۰۶۲ ۵۴ آثار الباقیہ صفحہ ۳۲۵ ۔

مذہب کیا ہے؟

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

چارلس ڈاروین شہرۂ آفاق مصنف "ابتدا الانواع" (اوریجن آف سپی شیز) اور انیسویں صدی کا سب سے نامور سائنس داں کہتا ہے۔ عبودیت اور پرستش کا جذبہ بہت پیچیدہ ہے۔ اسمیں محبت۔ احتیاج بالغیر۔ خوف۔ احترام۔ شکر گزاری آیندہ کے لیے امید اور ایک غیر مرئی اعلٰے اور ارفع ہستی کی کامل تابعداری اور شاید دیگر امور شامل ہیں"۔ ہر دو خیالات میں مذہب کے تین اہم امور اور خواص تسلیم کیے گئے ہیں۔ یعنے رفاقت و وصل (محبت) احتیاج اور ترقی (آیندہ کی امید) چوتھا عنصر یہ بھی ہے۔ کہ ایک عظیم قوت جو ہم سے بدرجہا بہتر ہے۔ مانی گئی ہے۔ میکس مولر صاحب نے مذہب کی جو تشریح کی ہے۔ اسمیں بھی غیر محدود اور غیر معلوم ہستی کے تسلیم کرنے کی ضرورت سمجھی ہے "مذہب یہ ہے۔ کہ غیر محدود کا ادراک ایسی صورتوں میں کیا جائے جس سے انسان کی اخلاقی خصلت پر نمایاں اثر پڑے[۵۱]"۔ اسمیں بھی دو امور ظاہر ہیں (۱) احتیاج (۲) ترقی جسکا اخلاقی چلن سے تعلق ہے۔

تاگ مولر[۵۲] ایک جرمن فاضل کہتا ہے۔ جسکا حوالہ میکس مولر صاحب نے اپنے لیکچروں میں دیا ہے "مذہب ایک طرح کا میلان طبیع ہے۔ جو جبلی احساس ذات باری کے ساتھ شامل ہو کر علم تاثر۔ اور

---

[۵۱] "نیچرل ریلجن" میکس مولر صاحب نوٹ صفحہ ۶۹ و ۱۸۸ ملاحظہ ہو۔

[۵۲] "نیچرل ریلجن" کے صفحے ۶۵ و ۶۴ کا نوٹ ملاحظہ ہو + ۱۲

عمل کے فعل میں اپنے تئیں ظاہر کرتا ہے۔

مذہب خوف کے ذاتی تاثرات اور نیز نامعلوم قوا پر کامل یقین رکھنے میں ہے۔ یہ قوا ایک قسم کے محرک کا کام دیتے ہیں۔ جو انسان کو دنیا کے اس تصور میں راحت حاصل کرنے کی تحریک و تحریص دیتی ہیں جسکی تائید تجربہ سے نہیں ہوتی (۲) اسمیں حسن پرستی کے تاثرات شامل ہیں۔ جن کی وجہ سے انسان مصدر حسن کی تعریف و توصیف میں بقدر محو ہو جاتا ہے اور اپنی جذبات میں مبتلا ہو کر اپنے لیے ایک ایسی خیالی دنیا قایم کر لیتا ہے جسمیں روحانی پاکیزگی۔ اور حسن بدرجہ کمال پر پایا جاتا ہے (۳) اسمیں اخلاقی جذبات ہیں۔ جن کے سبب انسان ایک ایسا نظام عالم ترتیب دینے پر مائل ہو جاتا ہے جس کے طفیل سے (ہمارے اخلاق جذبات) قابل فہم ہو جاتے ہیں[۵۱]" اس میں میلان فطرت اور جذبات پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اور یہ مذہب کے معنوی پہلو سے ہی متعلق ہے مگر صوری پہلو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ جو "احساس وجود باری میں پورا ہوتا ہے۔ یعنے غیر معلوم ہستی کا جبلی علم و احساس مذہب کا ضروری عنصر ہے

ڈاکٹر ریویل[۵۲] اپنی شہرہ آفاق تصنیف تاریخ مذہب کا مقدمہ" کے صفحہ ۲۵ پر مذہب کی تعریف یوں کرتے ہیں " مذہب سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کو اس جذبۂ اتحاد کے مطابق ترتیب و تعین کرے جو اس کے نفس ناطقہ کو مشیت مخفیہ (خداوند کریم) سے جو دنیا۔ اور

---

[۵۱] گفرڈ لیکچرز" ۱۸۸۸ء۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۴۲ و ۶۵ کا نوٹ۔ ۱۲

[۵۲] اے ریول (ریویل) ۱۸۲۶ء میں پیدا ہوئے فرنچ کالج میں مذاہب اضافی" کے استاد ہیں۔ اور مشہور فلاسفر تھیالوجین ہیں۔ ۱۲

روح پر حکمراں ہے۔ پیوست اور منسلک کرتا ہے۔ اور جس سے ربط وضبط رکھنے اور وصل وقربت محسوس کرنے میں اسے (نفس ناطقہ) اسقدر راحت وسرور حاصل ہوتا ہے۔"

پفلائی ڈرر اپنے "فلسفہ مذہب" کی جلد دوم کے ۲۹ صفحے پر لکھتا ہے "مذہب اس رشتہ کا نام ہے جو ہماری زندگی اور دنیا پر حکومت کرنیوالی قوت کے مابین واقع ہے۔ اور وہ قوت حیات کے ساتھ خلط ملط ہوکر ایک ہونے والی ہے" یہاں زندگی کے ربط وضبط پر زور دیا گیا ہے۔ جو غیر محدود زندگی کے درمیان قایم ہوتا ہے۔

دنیا پر حکومت کرنے والی قوت کے وجود کو تسلیم کرنے میں احتیاج بالغیر کا خیال لازم ٹھہرا۔ جب مستقبل کا ذکر کرتے ہیں۔ تو روحانی ترقی کا خیال بھی ماننا پڑتا ہے۔ جب روح اس دنیا سے چل دے گی۔ تو وہ اس سے بدرجہا بہتر اور پاکیزہ حالت حاصل کرے گی۔ ۱۲۔

ڈاکٹر جیمز مارٹینو[1] اپنے "فلسفہ مذہب" کی جلد اول کے پہلے صفحہ تمہید میں لکھتے ہیں "ابدالاباد تک زندہ رہنے والے خدا کی ہستی پر اعتقاد رکھنا مذہب ہے۔ یعنے مشیت ربانی پر جو عالم پر حکمران ہے اور انسان سے اخلاقی رشتہ قایم رکھتی ہے۔ ایمان لانا مذہب کا لب لباب ہے۔" اسی جلد کے تیسرے صفحہ پر لکھتے ہیں "مذہب پر اسنے خیال کے مطابق طریق خیال اور طریق تاثر تھا۔ اور ان کے درمیان کبھی نہ ٹوٹنے والا رشتہ پایا جاتا ہے" ازلی خدا پر ایمان کے ساتھ یہ بھی لازم آتا ہے کہ آیندہ

[1] انگلستان کے مشہور یونی ٹیرین فلاسفر اور تھیالوجین تھے ۱۸۰۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۰ء میں انتقال کیا۔ ۱۲۔

کی بابت بھروسہ رکھا جائے ۔ مان لیا گیا ہے کہ جہاں اخلاقی تعلق ہے وہاں روحانی اتحاد اور موافقت بھی لازم ٹھرتی ہے ۔

ایڈورڈ کیئرڈ ۔ ۔ ۔ ماسٹر آف بیلیل کالج ۔ آکسفورڈ ۔ جنکا گذشتہ نومبر میں انتقال ہوا ۔ اور جنکی تمام عمر علم مذاہب فلسفہ و ارتقاء مذہب کے مطالعہ اور تحقیقات میں گذری ۔ مذہب کی یوں تشریح کرتے ہیں " ہر قسم کے مذہب کی غائت ایک ہستی سے جس کا نام خدا ہے ۔ ایسا تعلق پیدا کرنا ہے جو محسوس ہو سکے ۔ مختلف مذاہب کا تصور اس ہستی ہمہ ایکی کی نسبت مختلف ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مذہب میں توحید کے مطلق اصول کا تصور بھی شامل ہے ۔ جو ہماری زندگیوں سے وابستہ ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ مذہب اس غیر محدود وحدت کا کم و بیش ترقی یافتہ شعور و تمیز ہے جو محدود کی تقسیم و تنصیف سے بالاتر ہے ۔ خاصکر ذات اور غیر ذات کے ادراک سے بعید ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شعور ذاتی کی ترقی کے ساتھ ساتھ ایک طرف احتیاج بالغیر کا احساس ہوتا ہے دوسری طرف شخصی عظمت و اقبال کی خواہش پیدا ہوتی ہے ۔ اور یہ تمنا ایسی ہے کہ انسان تمام عالم کو اپنے قبضہ میں لانے کا خواہشمند ہوتا ہے ۔ اور دنیا سے اپنی خواہشوں کی سیری کا کام لینا چاہتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ تصور خدا کے ارتقاء میں کثرت سے وحدت فطری سے روحانی اور محدود سے غیر محدود کی طرف ترقی کا رجحان پایا جاتا ہے خدا اپنے تئیں موجودات ۔ اور روح میں ظاہر کرتا ہے ۔ مگر روح میں اس کا ظہور زیادہ واضح ہوتا ہے ۔ لیکن انسان کی عقلی اور اخلاقی زندگی کی اعلیٰ ترین ترقیوں میں سب سے زیادہ اس کا مکاشفہ نمایاں ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ مذہب ہمیں محدود کے قیود اور حدود سے باہر نکال کر اوپر اٹھنے کی تحریک دیتا ہے ۔ اس میں انسان اپنی زندگی کا عکس دیکھتا ہے جو کسی قدر بدلا ہوا ہوتا ہے ۔ دنیا کی تمام رنجشیاں اور کل تفرقات رحمت ابدی میں منتقل ہو جاتی ہیں اور روحانی آفتاب کی کرنیں انہیں خوشگوار بنا دیتی ہیں [۵۱] (باقی آئندہ)

[۵۱] گفرڈ لیکچرز " ایوولیوشن آف ریلیجن " (ارتقاء مذہب) جلد اول (سنہ ۹۳-۱۸۹۰) فصل تشریح مذہب صفحہ ۱ سے ۸۳ تک ۔

"حُسن" کا مقدّمہ

مولوی احمد علی صاحب شوق قدوائی لکھنوی جنکی تصویر زیبِ ورق اوّل ہو۔ وُہ بزرگ ہیں جن پر ایشیائی شاعری مُدۃ العمر ناز کریگی۔ اصُولِ قدیم میں نئے رنگ کی چاشنی دیکر نظم کو موجُودہ رفتار کے مطابق کرنا اور اسی گل وبلبل کے قصّے کو جو اسی وقت مقبول تھا اور آج مرغوب نہیں ہی۔ عالمانہ اور فلسفیانہ خیالات سی معمور کر اس اُنیسویں صدی میں بھی جبکہ چاروں طرف سے اس پر لعن طعن ہو رہی ہی دلکش بنانا نہ صرف اُردو پر احسان ہے بلکہ ان مٹنے والوں کی شرم رکھنی ہے جن کے تخیلات اُسوقت موتی بکھیر رہے تھے اور اب ان کی ہنسی اُڑ رہی ہی۔ کیا اچھا ہو اگر آجکل کے نوجوان اپنی شاعری میں مولانا شوق کے اس طرز سے سبق لیں اور مغرب کی تقلید میں اپنی اصلی وضع کو ہاتھ سے نہ دیں۔

آج ہم مولانائے موصوف کی ایک نظم حُسن کے عنوان سے شروع کرتے ہیں جسکا یہ منظر مقدمہ جناب منشی جوالا پرشاد صاحب برق بی اے ایڈیشنل سشن جج (ملک اودھ) کا لکھا ہوا ہے۔

"حُسن" ایک ایسا لفظ ہی جس کا نقشہ لوگوں کے ذہنوں میں مختلف شکلوں سے کھنچتا ہی لیکن عموماً "حُسن" اُس کیفیت یا اُن خواص جسمانی کو کہتے ہیں جن کے نظارے یا اثر سے آنکھوں میں سرور۔ دل میں محبت یا اسی قسم کا کوئی اور جذبہ پیدا ہو۔ یہاں محبت سے وُہ دماغی مسرت یا قلبی سرور مراد ہی جو کسی حسین شے کے نظارے یا ادراک سے دماغ یا قلب میں جگہ حاصل کرلے۔ اکثر محبت کے ساتھ خواہش بھی پائی جاتی ہے مگر اِن دونوں کا ساتھ کچھ لازمی نہیں ہے۔ خواہش کو قلبی طمع یا دماغی جہد کہنا چاہئے جسکا ماحصل یہ ہی کہ فلاں شے ہمیں مل جائے۔ خواہش ایک ایسی چیز کے لئے بھی ہوسکتی ہی جس پر "حسن" کا اطلاق

نہ ہو سکے بلکہ ضرورت انسان کو اس کے حاصل کرنے پر متوجہ کر دے۔ لیکن محبت اُسی شے کی جانب دل اور دماغ کو لے جاتی ہے جسکا "حسن" نگاہوں میں کھب جائے۔

اکثر محبت کے ساتھ دل میں ولولہ۔ دماغ میں تلاطم اور طبیعت میں جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر یہ حالتیں کسی غرض سے متعلق ہیں تو ان کو حسن قرار دینا گویا حسن کے خوش رنگ دامن پر بدنما دھبا لگانا ہے۔ یہ اسی خواہش کے نتیجے ہیں جسکو ہم حسن کے باغ میں سبزۂ بیگانہ قرار دے چکے۔

"حسن" سے متاثر ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ قوت مدرکہ پورے طور پر کام میں لائی جائے۔ یہ ایسا منتر ہے جو پٹ ہی نہیں پڑتا اور ایسا جادو ہے جو چل کر فطرتی جذبات کو ضرور ہی مسخر کر لیتا ہے۔ جہاں حسین چیز نظر آئی۔ فوراً ہی "حسن" کی قوت مقناطیسی نے کشش کی اور بغیر سمجھے بوجھے دل اور دماغ نے دیکھنے والے کی رگوں میں محبت کا خون دوڑایا۔

"حسن" کے لوازم کیا کیا ہیں؟ یہ ایسا مشکل مسئلہ ہے جسکو حکما بھی اتفاق کے ساتھ حل نہیں کر سکے۔ اکثر تو وہ اس راستے میں ایک دوسرے سے جُدا گئے ہیں اور کم کم ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک دو کسی خاص ہیئت پر متفق ہو گئے مگر سوا اس کے کہ لفظ "حسن" کو یکدل ہو کر سب قبول کر لیں "حسن" کے لوازم پر جمہور کا اتفاق نہ ہوگا مختلف ممالک کے رہنے والوں کا اندازہ "حسن" کی تشخیص میں اکثر مختلف ہی ہو گا عام طور پر حسین شے ہر شخص کے دل کو چاہے وہ کہیں کا رہنے والا ہو اپنی جانب کھینچ ہی لیتی ہے اس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ "حسن" ایک ایسی دلکش چیز کا نام ہے جسکا حق دل تو ادا کر دیتا ہے لیکن زبان نہیں ادا کر سکتی۔

بعض حکما کا قول ہے کہ حسین وہی چیز ہے جو بہ کار آمد اور زیبا معلوم ہو مگر بدنما شے بھی بہ کار آمد ہو سکتی ہے۔ رہی زیبائی۔ یہ "حسن" کا سایہ ہے نہ کہ اس کی ذات۔

بعض کا قول ہو کہ حسین وُہ شے ہی جو اپنی جنس میں اُن صورتوں سے مشابہ ہو جو اُس میں اکثر پائی جاتی ہوں لیکن جو خاص ادائیں اسمیں پائی جائیں وُہ بہت کمیاب ہوں۔ اِن اُصُول کے مطابق بدل وہی شکل ہو سکتی ہی جو معمولی صورتوں سے مختلف ہو مگر اس کلیے کا تسلیم کرنا مشکل ہی اس لئے کہ کسی وقت ہماری نگاہوں کے سامنے ایک ایسی نئی چیز آجاتی ہے جو باصرہ یا مدرکہ کے لئے معمولی نہیں کہی جا سکتی۔ حالانکہ اُس کا "حسن" ہمارے دل کو اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے۔

بعض حکما مختلف شخصوں میں اندازہ "حسن" کے اختلاف کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ پیشتر سے جس شخص کے دل و دماغ میں جس قسم کے خیالات کا ذخیرہ موجود ہوتا ہی انہیں خیالات کی مناسبت سے وُہ کسی شے کو حسین یا قبیح قرار دیتا ہی۔ اور معمولی حواس کے ذریعے سے جو تجربہ پہلے ہو چکا ہی کہ فلاں چیز خوش آئند ہی وہی (تجربہ) کسی چیز کے پیش نگاہ آنے پر خیالات کو زیرِ اثر لا کر حُسن و قبح کا فیصلہ کرا دیتا ہی۔

ہم اُسی چیز کو حسین کہتے ہیں جس کے ادراک سے ہمارے اُن جذبات میں حرکت پیدا ہو جاتی ہی جن سے ہم متاثر ہو چکے ہیں اور جن کے فیض سے ہماری رُوح فرحت کا سرمایہ حاصل کر چکی ہی۔ اگر ہماری قوتِ باصرہ یا مدرکہ کے ذریعہ سے عالم حیات میں کوئی شے ہماری مسرت کا سبب بن چکی ہی۔ تو جس وقت کوئی دوسری شے ہم کو اسی مسرت انگیز شے کی یاد دلائیگی۔ ہم اس کو حسین خیال کرینگے ؎

فاش برگ گل و آں عذار آل کمیت زہر چہ جلوہ کند حسن را تمال کمیت

جس فلسفہ کو ہم نے ابھی بیان کیا ہی اسکی دلیل یہ بیان کی جاتی ہی کہ جن لوگوں کی طبیعتیں سرد اور خیالات سُست ہیں اور جنہیں غور کے ساتھ کسی شے کے دیکھنے میں حظ نہیں حاصل ہوتا اُن کے قلوب پر "حسن" کا جادو بہت کم چلتا ہی۔ برخلاف اس کے جنکی طبیعتوں میں اُمنگ ہی اور جنکی فطرت میل جول کے ولولوں کو لئے ہوئے جوش و خروش کے ساتھ ہر شخص سے ملنے پر اُن کو

اُبھارتی ہے وُہ ہر چیز کو نظرِ غائر سے دیکھتے ہیں اور اس قدر جلد "حسن" کا ادراک کر لیتے ہیں جس قدر جلد کھلی ہُوئی آنکھیں بجلی کی چمک کا احساس کر لیتی ہیں۔

ایک فلاسوفر کا قول ہے کہ "حسن" وُہی ہے جس کی آن بان سمجھ میں نہ آئے اور جس میں تناسب۔ موزونیت اور صفائی اعتدال کے ساتھ موجود ہو۔ وُہ اس اعتدال کو مستقل خوبی اور خوش نمائی کے ساتھ وابستہ کرتا ہے۔ اس فلاسوفر نے "حسن" کو جن شرائط کی زنجیروں میں جکڑا ہے۔ یہ سب اس کے صفات ہیں نہ کہ اسکی ذات مگر "حسن" کی یہ تعریف کہ اس کی آن بان سمجھ میں نہ آئے۔ بہت سچی اور اس قدر وسیع ہے جس کی تشریح زبان سے ادا نہیں ہو سکتی بلکہ حواس کے دائروں میں فطرت نے جتنی گنجائش رکھی ہے وُہ بھی اس کے لئے ناکافی ہے۔

عمومًا تناسب "حسن" کا نہایت ضروری جز سمجھا جاتا ہے یعنی جسم کے مختلف اجزا کی ہیئت یا مقدار میں ایک دوسرے کے ساتھ خاص تناسب ہونا چاہئے۔ فی نفسہٖ تناسب کا لفظ "حسن" کے لئے موزوں ضرور ہے لیکن یہ خاصیت "حسن" کے واسطے لازمی نہیں ہو سکتی۔ اکثر بڑے بڑے درختوں میں چھوٹے چھوٹے پھول اور چھوٹے چھوٹے درختوں میں بڑے بڑے پھول ایسے خوشنما پائے جاتے ہیں جنکے "حسن" کا نظارہ اپنے دامن کو مسرت کے پھولوں سے بھر لیتا ہے۔ طیور نیز اور جانوروں میں بھی بعض کی لانبی گردن اور چھوٹی دُم یا بعض کی چھوٹی گردن اور لانبی دُم ہوتی ہے مگر "حسن" کے زیور سے دونوں کی شکلیں آراستہ نظر آتی ہیں۔ اکثر طیور کے رنگوں میں بھی کوئی خاص مناسبت نہیں پائی جاتی۔ کسی کے جسم پر ایک ہی رنگ کے پروں کا لباس نظر آتا ہے اور کسی کے پیراہنِ حیات میں قوس قزح کے سب رنگ دیکھے جاتے ہیں۔ غرض رنگوں کا اختلاف کسی خاص تناسب کو قائم نہیں ہونے دیتا لیکن "حسن" کے خیال کو ضرور قائم کر دیتا ہے۔

اگر آپ کسی خوبصورت گھوڑے کی گردن کو دیکھ کر اس بات کا اندازہ کر لیں کہ اسکو اور عضا کے ساتھ کیا تناسب ہے۔ اور پھر کتے یا بلی یا اور کسی جانور سے اس کا موازنہ کریں تو یہ امر صاف ظاہر

ہو جائیگا کہ جس تناسب کو بعض حکما مختلف جانوروں میں "حسن" قرار دیتے ہیں وہ لازمی نہیں ہے اور آپ یہ نہ کہہ سکینگے کہ سوا گھوڑے کے اور سب جانور "حسن" کی دولت سے بے مایہ ہیں۔

انسان کے لئے "حسن" کا معیار یہ قرار دیا جاتا ہے کہ اسکے جسم کے مختلف اعضا تناسب کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ اس کلیے کا نتیجہ یہ نکلنا چاہئے کہ جس انسان میں ایسا تناسب پایا جائے وہ ضرور حسین کہا جائے۔ کہنا تو فلاسفرز کے اختیار میں ضرور ہے لیکن ایسا سمجھنے کے واسطے مشاہدے کو مجبور اور دلوں کو مغلوب کرنا ان کے اختیار میں نہیں بلکہ اس آن بان کے اختیار میں ہے جسکو ہم "حسن" سمجھتے ہیں لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ دلکش چیز کیا ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ دو شخصوں میں اعضا کا تناسب قریب قریب ایک ہی سا ہے مگر ایک ہی صورت دیکھ کر دل اُس کے "حسن" کی کشش سے بے چین ہو جاتا ہے اور دوسرے کی صورت سے کوئی خاص اثر پیدا نہیں ہوتا۔ اسکے برخلاف ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ دو شخص جن میں سے ایک کے تناسب اعضا کو قوت ممیزہ تسلیم کرتی ہے۔ مگر اسکی شکل "حسن" کی چمک دمک اور کشش سے خالی ہے۔ اور دوسرے کے اعضا تناسب سے معرا ہیں مگر اسکی آن بان "حسن" بنکر دل کو مسخر کئے لیتی ہے۔ ایسے موقع پر یہ سمجھنا پڑتا ہے کہ "حسن" کسی ایسی شے کا نام ہے جسکا حلیہ بتانا ہماری قوتِ ناطقہ کے بس میں نہیں ہے۔ لیکن ہماری آنکھوں کے راستے دماغ اور دل میں پہنچکر قوت مدرکہ اور احساس پر قبضہ کر لینا اسکا معمولی کرشمہ ہے۔

بعض حکما نے انسان کی گردن کے لئے "حسن" کا ایک پیمانہ قرار دیا ہے یعنی اسکا دَور پاؤں کے تلوے کے برابر یا کلائی کے دَور سے دو چند ہو۔ یہ تناسب موزونیت ضرور ہے اور اکثر "حسن" کی شان بھی پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن ایسے انسان بھی پائے گئے جنکی گردنیں اس تناسب کے سانچے کی ڈھلی ہوئی تو ہیں مگر اُن میں "حسن" کی آن بان نہیں ہے۔

رسکن نے تناسب کو "حسن" کا جزو اس دلیل کے ساتھ قرار دیا ہے کہ اگر کسی چیز کے مختلف حصوں میں کوئی حصہ نامناسب طور پر چھوٹا یا بڑا ہوتا ہے تو وہ چیز بدنما نظر آتی ہے۔ یہ دلیل ضرور

صحیح ہے لیکن یہاں بدنمائی "حسن" کی ضد نہیں ہے بلکہ معمولی صورت ہے یعنی جو شکل معمولی تناسب کے خداداد زیور سے آراستہ نہیں ہے وہ بدنما ضرور ہے مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جس شکل میں معمولی تناسب موجود ہے وہ حسین ضرور ہے اس لئے کہ مشاہدہ اکثر اس کے خلاف عینی شہادت دیتا ہے۔ ہاں مختلف اعضا کا ایک دوسرے سے تطابق "حسن" کے لئے ضروری ہے۔ مثلاً خدار ستون اُس چھت کے ساتھ خوشنما نظر آتے ہیں جس کی بلندی اور وسعت ستونوں کے خم کے ساتھ اعتدال کی صورت رکھتی ہو لیکن جب چھت بہت بڑی ہوتی ہے تب وہی خدار ستون اس سے میل نہیں کھاتے کیونکہ اُن کا خم جو نزاکت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پیش کرتا ہے وہ ایسی بلندی یا وسعت کو جو اس کی نزاکت پر گراں ہو خوش نمائی کی حدود سے باہر رکھتا ہے۔

بعض حکما نے بغیر کسی دلیل کے بایہ کہنے کہ تناسب کے نہ پائے جانے پر بعض اشجار یا بعض طیور کے "حسن" دلفریب سے مجبور ہو کر اس امر کو تسلیم کر لیا ہے کہ اشجار اور طیور عموماً حسین ہیں۔ مگر اس کلیئے کا قبول کر لینا مشکل ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی کلیہ استثنا سے خالی نہیں ہو سکتا۔ تو یہاں بھی استثنا کی ضرورت تھی لیکن جو حکما اس کلیئے کے قائم کرنے والے تھے نہ انکی نگاہیں نہ تمام طبقۂ ارض کے اشجار کو دیکھ سکتی تھیں نہ طیور کو۔ ورنہ بدنما جٹاؤں والے برگد کے پیڑ اور تناسبِ اعضا سے محروم اور بدہیئت شتر مرغ کو وہ حسینوں کے شمار میں نہ لیتے اور انکو یا مثل ان کے اور بعض اشجار اور بعض طیور کو استثنا کے دائرے میں داخل کرتے۔

جن اشجار اور جن طیور یا اَور جانوروں میں تناسب نہیں ہوتا وہ مذاق صحیح اور اصول تسلیم شدہ کے رُو سے نہ حسین قبول کئے جاتے ہیں نہ کہے جا سکتے ہیں۔ اگر انکو کسی کی نگاہ حسین قرار دے تو وہ دراصل اُس شئے کے "حسن" کی دل فریبی نہیں ہے بلکہ تعلیم۔ اخلاق۔ عادات اور ایسی ہی اشیا وغیرہ کے نقص سے جو نقص مذاق میں پیدا ہو جاتا ہے وہ "حسن" کے اندازے میں غلط فہمی کرتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہر کارآمد شئے بعض موقع پر خوش نمائی کا دعویٰ کر اٹھتی ہے اگرچہ وہ اصولاً خوش نما نہ ہو۔ مثلاً ایک شخص میدان کی کڑی دھوپ سے تا دیکھا یا ہوا کسی برگد کے سائے میں

پہنچ جائے تو باوجود اس امر کے کہ برگد کی ناہموار شاخیں اور پریشان جٹائیں خود اپنی بدنما صُورتوں سے تناسب کا فقدان ثابت کر رہی ہوں لیکن سائے کے بہ کار آمد ہونے سے جو آرام سایہ پانے والے کو پہنچا ہے وُہ پیڑ کو بہ کار آمد ثابت کر کے اُسکی آنکھوں میں پیڑ کی خوشنمائی کا رنگ بھر دیگا۔

حکما نے جن چیزوں میں تناسب کے نہ ہونے پر بھی "حسن" کو تسلیم کر لیا ہے اُنکا یہ بے دلیل فیصلہ قابلِ غور ہے۔ "حسن" کا مسئلہ فلسفیانہ ہے۔ کچھ الہیات کا مسئلہ نہیں ہے کہ خُدا کو بلا دلیل مان لو تو ہزار دلائل سے بڑھ کر عقیدے کا استحکام ثابت ہو جائے۔

تناسب جسکو "حسن" کے لئے لازمی قرار دیا ہے اُس میں بھی حکما نے ابہام ہی رکھا یا تو انکشاف میں ایسی دشواریاں پیش آئیں جنکا حل کرنا مشکل ہو گیا یا مسئلے کی وسعت سے تنگ آکر انکشاف کا رمز نظارہ بازکے فہم پر چھوڑا کہ وُہ خود صورت کو دیکھ کے "حسن" کے سونے کو اپنے مذاق کی کسوٹی پر کسے اور کھرے کھوٹے کو پرکھ لے۔

بتانا چاہئے تھا کہ کس جز کو کس جز کے ساتھ تناسب چاہئے اور کس قدر چاہئے۔ اس کے بعد یہ بحث لازمی ہوتی کہ بعض ایسی شے جسکے اجزا میں تناسب نہیں ہوتا وُہ کیوں نگاہوں کو "حسن" کا جلوہ دکھاتی ہے۔ یا بعض ایسی شے جس میں تناسب پایا جاتا ہے وُہ کیوں "حسن" کی کشش سے معرا نظر آتی ہے۔

گھوڑے کے تناسب کو کتے یا بلی کے تناسب سے ملانا خود غلط راستہ اختیار کرنا ہے۔ یہ روش "حسن" کو فلسفہ کے اُس راستے سے دُور کھینچے لئے جاتی ہے۔ جس میں بہ کار آمد شے کا وجود حسین قرار دیا گیا ہے۔

اگرسٹہ کہتا ہے کہ بہت بڑی چیز حسین نہیں ہوتی۔ وُہ یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ ہم چھوٹے چھوٹے پرندوں اور چوپایوں کو دیکھ کر ان کے "حسن" کے اثر سے مغلوب ہو جاتے ہیں اور اُنکو محبت سے پیار کرتے ہیں۔ محبت کا یہ جذبہ بڑی بڑی چیزوں کی ہیئتوں

سے ہمارے دلوں کو مسخر نہیں کرتا۔ انکی شان و شوکت اپنے رُعب اثر سے ہم کو اپنا معترف
بناتی ہی لیکن محبت کرنے والا نہیں بناتی۔

وُہ کہتا ہی کہ تعریف اور محبت میں فرق ہی۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بیشک فرق ہی لیکن محبت
صرف "حسن" ہی کی پابند نہیں ہی۔ وُہ رشتے کے ساتھ ہے۔ احسان کے ساتھ ہی اسی طرح اور
دُنیاوی تعلقات بھی ایک دوسرے کو محبت کی زنجیر میں جکڑے ہُوئے ہیں۔ محبت کی دلیل
ضعیف ٹھہری تو اُس سے قطع نظر ہُونے پر بُری شے کی خوبی کا اعتراف خود "حسن" کا اعتراف
ہوگیا بہ شرطیکہ تناسب کی خوبی جو "حسن" کا لازمی جز قرار دی گئی ہی۔ اُس میں موجود ہو۔

ارسطاطالیس اعتدال کو "حسن" قرار دیتا ہی۔ اسکا قول ہی کہ ایسی چھوٹی یا ایسی بڑی شے
جسکو ہم ایک نگاہ سے پُورے طور پر نہ دیکھ سکیں۔ وہ حسین نہیں ہی۔ یہ دلیل بھی ضعف سے خالی
نہیں۔ انسان جسکو دیکھ کر ہم اُس کے "حسن" کی کشش سے بے چین ہوجاتے ہیں۔ کیا وُہ
"حسن" کے دائرے سے صرف اس دلیل کے ساتھ خارج کردیا جائیگا کہ ہم اسکو سر سے پاؤں
تک ایک نگاہ سے نہ دیکھ سکے۔

عمومًا نرمی اور سطح کی صفائی "حسن" کے لئے لازمی چیزیں سمجھی گئی ہیں۔ اسمیں کچھ شک
نہیں کہ پھول کی نرم نرم پنکھڑیاں اور درختوں کی چکنی چکنی پتیاں لامسہ اور باصرہ کو اپنی خوبیوں
کی جانب مائل کرکے قوتِ مدرکہ پر "حسن" کا سکہ بٹھا دیتی ہیں۔ انسان کا نرم اور صاف بدن۔
جانوروں کی ملائم کھال اور ان کے چکنے بال طبیعت کو اپنی طرف راغب کرلیتے ہیں لیکن عام
طور پر اس کلیے کے تسلیم کرلینے میں بھی اُس وقت تک تامل ہی جبتک استثنا نہ قایم ہو۔
کیا بغیر ان لوازم کے دُنیا کی کوئی شے حسین ہو ہی نہیں سکتی؟ اکثر چھوٹے چھوٹے خاردار
پودے جس میں نرمی اور سطح کی صفائی مطلق نہیں پائی جاتی۔ آنکھوں میں کھب جاتے ہیں اور
قدرت نے ان کانٹوں کے پیرایے میں "حسن" کا زیور جو انکو پہنادیا ہی وہ دل کو لبھا لیتا ہی۔
بوقلمونی بھی "حسن" کا جز سمجھی جاتی ہی بہ شرطیکہ اس سے طبیعت میں الجھن نہ پیدا ہو۔ اس کے

ساتھ سادگی کا میل جول بھی ضروری ہی۔ تاکہ مختلف کیفیتوں کو ہم آسانی کے ساتھ محسوس کرکے اُن سے حظ حاصل کرسکیں۔ لیکن اگر سادگی بوقلموں کو مغلوب کرکے خود غالب آجائے تو وُہ شے جسکی بوقلمونی غالب ہونے کی شکل میں ہمارے دل کو اپنی جانب کھینچتی۔ مغلوب ہونیکی شکل میں لُطف کو بے لطفی سے دبا دیگی۔ دیکھو بعض عورتوں کے سینے ابر گودن کے حصّوں میں صفائی۔ نرمی اور سڈول نشیب و فراز کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن یہ آثار چڑھاؤ ایسی سادگی کے ساتھ ہوتا ہی جس سے بوقلموں کا لُطف دب جاتا ہی اور حسن کو "حُسن" کا لُطف حاصل نہیں ہوتا۔

کسی شے میں جسامت مزید اور قوت مفرط کا پایا جانا "حسن" کے لئے مضر قرار دیا گیا ہی۔ یہ صحیح ہی کہ نزاکت "حسن" کی جان ہی۔ بڑے بڑے تناور درختوں اور جانوروں کی شان دل میں شوکت اور عظمت پیدا کردیتی ہی مگر جیسا مسرور کردینے کا مذاق چھوٹے چھوٹے درختوں۔ نازک نازک پھولوں۔ پتّیوں اور متوسط قد کے جانوروں میں ہوتا ہی۔ ویسا تناور درختوں اُونٹ جانوروں میں نہیں ہوتا۔ بڑ او پیپل کے درختوں سے گل اور لالے کے درختوں کا مقابلہ کرو شتر مُرغ سے طاؤس اور لال کو ملاؤ۔ ایک جسیم گھوڑے کے ساتھ نازک اندام عربی گھوڑے کو دیکھو۔ نزاکت خود "حُسن" بنکر نظارے کو اپنی جانب مائل کریگی۔

رنگ بھی "حسن" کا ایک جزو مانا گیا ہی اگرچہ یہ تصفیہ دشوار ہوگیا کہ کون رنگ کس طور پر "حُسن" کو چمکاتا ہی۔ رنگ کا ماندا یا میلا یا بہت شوخ ہونا "حُسن" کے لئے مُضر ہے۔ اسکے واسطے ہلکا نیم رنگ موزوں سمجھا گیا ہی۔ وُہی چہرہ خوبصورتی کے باغ کا ایک خوشنما پھول قرار دیا جائیگا۔ جسکا رنگ نہ بہت سُرخ ہو نہ سپید۔ نہ زیادہ چمکدار۔ بلکہ جس میں یہ سب خوبیاں مناسب اندازے سے ملی جُلی پائی جائیں اُسی کو "حسن" کی محفل میں عزت کی جگہ دی جائیگی۔

بعض کا قول ہی کہ رنگ "حسن" کے لئے وہیں تک ضروری ہی۔ جہاں تک مسرت انگیز چیزیں یاد دلائے مثلاً سپیدی سویرے کی چہل پہل اور اُسکی خوشیاں۔ آسمانی سی سنجیدگی۔ سبزی کو موسم بہار

کی شادابیاں نظروں کے سامنے پھر جائیں۔ یہ فلسفہ کی بلند پروازیاں ہیں جنکو عام نظارہ باز دل کی نگاہیں نہیں پاسکتیں۔ وہ تو حُسن کی کشش کو محسوس کر سکتی ہیں۔ چاہے وہ جس جگہ کے دلفریب پیرایہ میں ہو۔

مادی اشیا کے علاوہ اور چیزوں میں بھی حُسن کی جھلک پائی جاتی ہے۔ مثلاً نیک اور پاک خیالات کا حُسن انسانی ہمدردی کا حُسن سُریلی اور اچھی آواز کا حُسن لیکن اس مختصر مقدمے میں ایسی طویل بحثوں کی گنجائش نہیں ہے۔

بعض حکما نے قوتِ ذائقہ و لامسہ میں بھی حُسن قرار دیا ہے۔ الیسن اور ہاگرتھ شکل کو حُسن کے اوصاف میں داخل کرتے ہیں۔ برک کہتا ہے کہ قلت حُسن کی شان ہے۔ رسکن موزونیت تناسب اور وحدت کو حُسن کہتا ہے۔ سرجوشا رینالڈس رواج سے حُسن کا وجود مانتا ہے۔ سقراط تعلقات سے حُسن پر خیال کر جاتا ہے لیکن یہ قول سقراط کا بمشکل سے قابلِ تسلیم کرنے کے ہے کہ جو شے پسند ہو اُسی کا نام حُسن ہے۔

بہرحال وہ تمام حکما جو حُسن کی فلسفہ کے وسیع میدان میں علم اور فہم کی قوتوں سے قلموں کی رفتاریں دکھلانے پر آمادہ ہوئے۔ ایک دوسرے سے علیحدہ مختلف راستوں پر گئے۔ مشکل یہ ہے کہ اگر سب اقوال لیکر تطبیق کا قصد کیا جائے تو حُسن کا دائرہ اس قدر تنگ ہو جائے کہ چاہے دل کھینچ کے کسی شے کے حُسن کا ہو رہے لیکن زبان کو اُس شے کا حسین کہنا مشکل ہو۔

ہم کو حُسن پر اس مختصر مقدمے کے لکھنے کی ضرورت صرف اس سبب سے ہوئی کہ یہ فلسفہ کا مسئلہ اگرچہ فلسفیانہ مباحث میں بہت رُوکھا پھیکا ہے لیکن ہمارے دوست شوق نے اسکی باریکیاں پیچیدگیوں۔ نزاکتوں اور تمام خوبیوں کو نظم میں ایسی فصاحت۔ لطافت اور حُسن بیان کے ساتھ ادا کیا ہے جنکا نثر میں ادا کرنا مشکل تھا۔ شاید بعض ایسے ناظرین کو اس مثنوی کے لطیف مضامین کا لُطف نہ حاصل ہوتا جنکی نگاہیں حکما کی بحثوں سے ناآشنا ہیں۔ یہی خیال ہے جس نے اس مختصر مقدمے کے لکھنے پر مجھے متوجہ کیا۔ اسکے اختصار کی وجہ سے گو تمام فروع پر دماغات حاوی نہ ہوں لیکن اصول کو پیشِ نظر

رکھ لینے پر مثنوی کے مضامین کا لطف حاصل کرنا ضرور آسان ہو جائیگا۔

اس مثنوی کو جس کا اسم بامسمیٰ "حُسن" ہے دیکھ لینے کے بعد ارباب فہم اس امر کا فیصلہ فرمائینگے کہ اُردو کے باغ کو ایسے ہی اعلیٰ مباحث اور دلکش خیالات کے خوش رنگ پھولوں سے آراستہ کرنے کی کس قدر ضرورت ہے۔ اب یہ امر بھی قلموں کے زور پر دماغوں کے حدود سے نکل کر صفحوں کی سرزمین پر آ جائیگا کہ فلسفیانہ خیالات بھی لطیف شاعری کے رنگ میں ڈوب کر کیسے رنگین اور دلاویز ہو جاتے ہیں ٭

راقم جوالا پرشاد برقؔ

حُسن

اے حُسن عجیب چیز ہے تو　　پیارا ہے تو عزیز ہے تو

ہیئت کا شریکِ حال ہوکر　　روشن ہوا تو جمال ہوکر

خارج میں جمال ساتھ تیرے　　داخل میں خیال ساتھ تیرے

فطرت نے اثر دیا ہے تجھ کو　　نیرنگ سے بھر دیا ہے تجھ کو

وہ قوّتِ جذب تو نے پائی　　جسکا شیوہ ہے دلربائی

وجدانِ صحیح پر ترا زور　　اقلیم دماغ میں ترا شور

مقناطیسی کشش ترا کھیل　　دل کو سببِ تپش ترا میل

اطرافِ جہاں کو تو نے گھیرا　　چھایا ہے دلوں پہ رُعب تیرا

قابو ترا ہوش پر خرد پر　　یہ بھی زد پر ہے وہ بھی زد پر

مفہوم کی جان تیری صورت　　ادراک کی رُوح تیری مورت

آساں نہیں تیرا راز کہنا　　شکل[1] کا لباس تو نے پہنا

[1] حکیم البین کا قول ہے کہ شکل اوصاف حسن میں داخل ہے۔

تحریر میں آ سکے تو یہ دشوار — حرفوں میں سمائے تو یہ دشوار

لازم تجھے منحصر نہیں تو — بند ایک ہی شکل پر نہیں تو

مطلوب کا لفظ تجھ پہ حاوی — تو خوب سے وزن میں مساوی

تو ہے وُہی جو کھبے نظر میں — بس جائے تصورِ بشر میں

تو ہے وُہی لوٹ جس پہ دل ہو — جس لطف پہ ذہن منتقل ہو

یکسا پست و بلند ہونا — ہے حسن فقط پسند[۱] ہونا

حسنِ رخ و مو ہے ایک ہی چیز — ہر شکل میں تو ہے ایک ہی چیز

وہمی تجھ میں جمال تیرا — ظنی ہمہ میں خیال تیرا

مرغوب صبیح اس بشر کو — محبوب ملیح اس نظر کو

کالی آنکھوں کی ایک کو چوٹ — نیلی آنکھوں پہ دوسرا لوٹ

معشوق کہیں وہ حسن والے — جن کے گیسو ہیں کالے کالے

بھورے بالوں پہ کوئی شیدا — سونے کی چمک ہو جن سے پیدا

اُس کا رخ خوش نما کتابی — اِس کا رخ روشن آفتابی

اونچے قد سے وُہ دل رُبا ہو — چھوٹے قد سے یہ فتنہ زا ہو

تجھ سے نہ تو وُہ نہ یہ ہے خالی — سب فرقِ پسند ہے خیالی

جس طول میں تو وُہ طول ہو خوب — جس عرض میں تو وُہ عرض مرغوب

جس آنکھ میں تو حسیں وُہی ہے — پیاری وُہی دل نشیں وُہی ہے

تو رنگ اپنا جو رخ میں بھر دے — رخ آتشِ گل کو سرد کر دے

تو قد میں جو آئے تن کے نکلے — اعضائے سڈول بن کے نکلے

اوہامِ فلاسفہ بنا تو — لیکن نہ قیاس سے چھنا تو

---

[۱] سقراط کا قول ہے کہ جو شے پسند ہو اُسی میں حسن ہے۔

تحقیق کے حصر میں نہ آیا | اس دائرے میں نہ تو سمایا

جس نے ترے در کی خاک چھانی | اُس نے کہی اک نئی کہانی

کہتا کہ بڑے[۱] میں تو نہیں ہے | کچھ عقل کی گفتگو نہیں ہے

قلت[۲] میں ہے تو یہ قصہ بیکار | کثرت میں ہے تو یہ حصر دشوار

موقوف نہیں ہے تو اُپچ پر | سیدھے پہ نہ منحصر نہ کج پر

ممکن نہیں ایک بات پر حصر | بیجا ہے تعلقات[۳] پہ حصر

وحدت[۴] میں ہے اصل ذات تیری | کثرت میں ہے کائنات تیری

اصنام میں تو ہے دل فریبی | اجسام میں تو ہے جامہ زیبی

تو کھینچے جو صورت تناسب[۵] | پوری ہو ضرورت تناسب

جوبن دلدار میں ہے تو ہی | سینے کے اُبھار میں ہے تو ہی

جادو کا اثر نظر میں تجھ سے | بجلی کی ادا کمر میں تجھ سے

تنگی ہے دہانِ تنگ میں تو | سُرخی ہونٹوں کے رنگ میں تو

شوخی کی ادا میں شان تیری | دامانِ حیا میں آن تیری

تو سُرمۂ چشمِ فتنہ پیکر | تو رنگِ حنائے دستِ دلبر

سج دھج تو ہے نکھار تو ہے | زیور تو ہے سنگار تو ہے

جنت کی ہوس ترے سبب ہے | شہرت تری حور کے لقب ہے

دل بستہ ہوں جس کے ایسی مے تو | چاہیں جسے مردم ایسی شے تو

ہیبت تیری دلوں پہ غالب | ہیئت تیری دلوں کی طالب

جلوہ ترا باصرہ کی حیرت | نغمہ ترا سامعہ کی رغبت

---

۱ حکیم ہاگرتھ کا قول یہی ہے۔ ۲ برک قلت کو حسن میں داخل کہتا ہے ۳ سقراط کہتا ہے کہ تعلقات سے حسن پیدا ہوتا ہے ۴ یہ رسکن کا قول ہے کہ وحدت حسن میں داخل ہے ۵ رسکن تناسب کو حسن کی کیفیت ضروری کہتا ہے

گذرے زمانہ کی یاد

اکثر شبِ تنہائی میں — کچھ دیر پہلے نیند سے
گذری ہوئی دلچسپیاں — بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمعِ زندگی — اور ڈالتے ہیں روشنی

میرے دلِ صد چاک پر

وُہ بچپن اور وُہ سادگی — وُہ رونا وُہ ہنسنا کبھی
پھر وُہ جوانی کے مزے — وہ دل لگی وُہ قہقہے
وُہ عشق وُہ عہدِ وفا — وُہ وعدہ اور وُہ شکریہ
وُہ لذتِ بزمِ طرب - یاد آتی ہیں اک ایک سب — دل کا کنول جو روز و شب — رہتا شگفتہ تھا سو اب
اُسکا یہ ابتر حال ہے — اک سبزہ پامال ہے
اِک پھول کُملایا ہوا — سوکھا ہوا بکھرا ہوا

روندا پڑا ہے خاک پر

یُوں ہی شبِ تنہائی میں — کچھ دیر پہلے نیند سے
گذری ہوئی ناکامیاں — بیتے ہوئے دن رنج کے
بنتے ہیں شمعِ بیکسی — اور ڈالتے ہیں روشنی

اُن حسرتوں کی قبر پر

جو آرزوئیں پہلے تھیں — پھر غم سے حسرت بن گئیں
غم دوستونکے فوت کا — اُنکی جوانا موت کا
لے دیکھ شیشے میں مرے — اُن حسرتوں کا خون ہے

جو گردش ایام سے جو قسمت ناکام سے یا عیش غم انجام سے مرگ بت گلفام سے
خود دل میں ہے تیر مژگاں کس طرح پاؤں میں حزن ہیں
قابو دل بے صبر پہ

جب آہ اُن احباب کو میں یاد کر اُٹھتا ہوں جو
یوں مجھ سے پہلے اُٹھ گئے جس طرح طائر باغ کے
یا جیسے پھول اور پتیاں گر جائیں سب قبل از خزاں
اور خشک رہ جائے شجر

اُس وقت تنہائی مری بنکر مجسم بیکسی
کر دیتی ہے پیش نظر ہو حق سا اک ویران گھر
برباد جسکو چھوڑ کے سب رہنے والے چل بسے
ٹوٹے کیواڑ اور گھر گیا چھت کے ٹپکنے کے نشاں
پرنالے ہیں وہ نہیں یہ حال ہے آنگن نہیں پردے نہیں چلمن نہیں اک شمع تک روشن نہیں
میرے سوا جسمیں کوئی جھانکے نہ بھولے کبھی
وہ خانہ خالی ہے دل پوچھے نہ جسکو دیو بھی
اُجڑا ہوا ویران گھر

یوں ہی شب تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے
گذری ہوئی دلچسپیاں بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمع زندگی اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دل صد چاک پہ

(از مس ٹامس مور) نادر علیخان نادر کاکوروی

بے ثباتیٔ زندگی

زندگی کیا کوئی ستارہ ہی — کہ ابھی آسماں سے ٹوٹا ہی
یا ہی شاید عقاب کی پرواز — اُڑ کے جو آسماں پہ پہنچا ہی

یا ہی یہ موسمِ بہار کا رنگ — جو تر و تازگی سے نکھرا ہی
یا اِسے قطرہ اوس کا کہئے — جو فلک سے زمیں پہ ٹپکا ہی

یا یہ آب و ہوا کا طوفان ہی — قلزمِ دہر پر جو چھایا ہی
یا سمندر کا بلبلا ہی یہ — پانی کی سطح پر جو اُبھرا ہی

قرض کی طرح زندگانی ہی — آج لینا ہی کل کو دینا ہی
سٹ کے رہتا ہی جوش تن میں یہی — بلبلا اُٹھ کے ٹوٹ جاتا ہی

جو نکھرتا ہی سب بہار کا رنگ — جب زمانہ خزاں کا آتا ہی
خشک ہو جاتا ہی قطرۂ شبنم — روئے خورشید جب چمکتا ہی

ہی اسی طرح آدمی کا حال — یاں جو آیا ہی اسکو جانا ہی
موت لازم ہی زندگی کیلئے — سچ ہی مثلِ سرائے دنیا ہی

دِل لگانا فضول ہی اِس پر — زندگانی کا کیا بھروسا ہی

[illegible]

تازہ غزلیں

بانکپن کی نوک ہی اُس کی نظر میں کچھ نہ کچھ — رہتی ہی ہر دم کھٹک میرے جگر میں کچھ نہ کچھ

نورِ قدرت ہو گیا سب صرف جسمِ صاف میں — رہ گئی آخر کمی اس کی کمر میں کچھ نہ کچھ

کر گئی صحبت اثر اُسکے رخِ گلرنگ کی — آ گئی سرخی میرے اشکِ چشمِ تر میں کچھ نہ کچھ

سامنے ہوتے کے ہستی اِک ذرا سے دل کی کیا — فائدہ سوچے ہوئے ہیں ہم ضرر میں کچھ نہ کچھ

ہجر کی شب - اصل ظلمت جانئے - تو بدلی سہی — شک کی نوبت آ ہی جاتی ہی سحر میں کچھ نہ کچھ

کوئی جھڑکی - کوئی گالی - کوئی ٹکڑا داغ کا — بانٹتے ہی رہتے ہیں وہ اپنے گھر میں کچھ نہ کچھ

عشق کے قبضے میں ہی شوق آج کل قصرِ دماغ — درد یا سودا - غرض رہتا ہی سر میں کچھ نہ کچھ

[illegible]

خ

منظور ہو جو سیر سپید و سیاہ کی
گردش کو دیکھ دیدۂ عبرت نگاہ کی
گھبرا کے سب نے اُنکی طرف جب نگاہ کی

کس دل شکستہ نے دمِ آخر یہ آہ کی
بدلی سمجھ نہ کیفیتِ کج نگاہ کی
کرنے کو یوں تو ساری تمنا نباہ کی

موسیٰ کی بیخودی نے وہ تعظیم شاہ کی
تصویر کھینچ چلی تھی تری جلوہ گاہ کی
وقتِ اخیر کر نہ سکے بات تو رہا

کشتہ پہ اپنے شرم سے اُس کم نگاہ کی
آیا ہے جب سے حضرتِ موسیٰ کو غش بہ یاد
صورت بدل گئی ہے تری جلوہ گاہ کی

ذروں سے ہی اُسی کے کواکب کا انتظام
جو خاک اُڑ رہی ہے تری جلوہ گاہ کی
لکھا ملا سو قہ شالم بحر میں

یارب دراز عمر ہو زلفِ سیاہ کی
مُنہ سے اُڑے ہیں بخیہ زخمِ جگر کے تا
اُس مہر سے پوچھیں شبِ غم نے آہ کی

آنکھوں میں ہے جو نورِ بصیرت ہے انکو تو
تصویر آ بار لائی تری جلوہ گاہ کی
افشائے راز گریۂ یعقوب ہو گیا

تصویر آنسوؤں میں ہے نورِ نگاہ کی
ہر آہ دل گداز ہر اک نالہ رسا
تمہید ہے خیرہ حالِ تباہ کی

پروانے کو ملی ہے مکافاتِ عاشقی
پر کیا جلے کہ دستگیر فردِ گناہ کی
آزادگانِ عشق کی گستاخیاں تو دیکھ

خود داد مانگتے ہیں تجھی سے گناہ کی
کہتی ہے روح آئی ہیں جینی کر ہچکیاں
بس سخت منزلیں تھیں وہی مجھکو راہ کی

محشر میں انکو دیکھ کے اللہ رے خوشی
تردید کر رہا ہوں خود اپنے گواہ کی
ٹھہرا رہے ہو تم جسے ملزم بہک کر

تقریر کیا یہی تھی کسی عذر خواہ کی
اُڑتی ہوئی یہ خاک پریشان یہ ہوا
تشریح ہے عزیز کے حالِ تباہ کی

مرزا احمد ہادی عزیز لکھنوی

م

سرور افزا ہوئی آخر شراب آہستہ آہستہ
ہوا وہ بزم ہی میں بے حجاب آہستہ آہستہ

رخِ روشن سے یوں اُٹھی نقاب آہستہ آہستہ
کہ جیسے ہو طلوعِ آفتاب آہستہ آہستہ

کیا جب شوق نے اُس سے خطاب آہستہ آہستہ
حیا نے بھی دیا آخر جواب آہستہ آہستہ

وہ مستی خیز نظریں فتنہ رفتہ لے اُڑیں مجھ کو
کیا کاشانۂ دل کو خراب آہستہ آہستہ

بڑھا ہنگامۂ شوق اسقدر بزمِ حریفاں میں
کہ رخصت ہو گیا اُنکا حجاب آہستہ آہستہ

کیا کامل ہمیں اک عمر میں سوزِ محبت نے
ہوئے ہم آتشِ غم سے کباب آہستہ آہستہ

عبث تھا ضبط کا دعویٰ ستم اُسکے ستم نکلے
نگاہیں ہو گئیں آخر پُر آب آہستہ آہستہ

دبستانِ وفا کی زندگی بھر خاکروبی کی
سمجھ میں آئی اُلفت کی کتاب آہستہ آہستہ

ہمارا دستِ شوق اب ہو چلا گستاخ سا کچھ کچھ
کرے بدمست انکو بھی شباب آہستہ آہستہ

بقدرِ شوق اُسے تابِ تپیدن تھی کہاں قاتل
کیا بسمل نے تیرے اضطراب آہستہ آہستہ

بلا ہیں شاہدانِ شہرِ وحشت میری بستی میں
ہوا میں اُن کی صحبت میں خراب آہستہ آہستہ

رضا علی وحشت

ملک کی خوش نصیبی

دہلی میں دیسی ادویات کا ایک ایسا کارخانہ جس پر آپ کافی بھروسہ کر سکتے ہیں قائم
ہوگیا جناب حاذق الملک حکیم حافظ اجمل خان صاحب نے طب یونانی
کو زندہ رکھنے کے لیے جو اعلیٰ قدر خدمت انجام دی ہیں اس دواخانہ کا قیام ان
خدمات کے نتیجہ خیز ہونے میں شمار کیا گیا ہے سب سے بڑا نقص جو دیسی طب کا یہ
تھا کہ اصلی دوائیں دستیاب نہیں ہوتی تھیں اب یہ شکایت بالکل دور ہوگئی۔
پانسو یونانی اور ویدک مرکبات اصل نسخوں کے موافق عمدہ اجزا اور پورے اوزان سے
بنے ہوئے اس دواخانہ میں طیار ہیں، نیز جناب حاذق الملک کے خاندانی تجربات
بھی جن کا ہندوستان کے سب سے بڑے دیسی مطب میں لاکھوں مریضوں پر تجربہ
ہو چکا ہے ہر مرض کی دوائیں بھروسے کے قابل اس دواخانہ میں موجود ہیں عام لوگ
کیا اچھے ہوشیار طبیب بھی اسی دواخانہ سے دوائیں طلب کرتے ہیں جو اصحاب ایک
دفعہ دوا منگاتے ہیں وہ دواخانہ کے مستقل خریدار ہو جاتے ہیں کیونکہ دواسازی کا
اس دواخانہ میں مکمل انتظام ہے اور وہ نسخہ جو یونانی اور ویدک کتب میں انتخاب ہیں
کسی قسم کی خرابی معاملے میں نہیں اس لئے کہ یہ دواخانہ کوئی شخصی دواخانہ نہیں
مدرسہ طبیہ و زنانہ شفاخانہ دہلی کو اپنی آمدنی دیدیتا ہے اور ایک کمیٹی جس کے پریسیڈنٹ جناب
حاذق الملک ہیں اس کی منتظم ہے تازہ فہرست مفت تار کا کافی پتہ۔ [illegible]

کل خط و کتابت بنام منیجر ہندوستانی دواخانہ دہلی
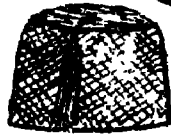
محسن الملک پیٹنٹ
یہ اُس نئی وضع کی ترکی ٹوپی کا نام ہے جو ہم نے ابھی انگلستان کے
مشہور کارخانے کرسٹی سے اپنا خاص آرڈر بھیجکر بنوائی ہے۔
رنگ نہایت خوشنما اور وضع بہت فیشن ایبل استر تمام ولایتی ہے
کہ جس سے ٹوپی کبھی خراب نہ ہوگی یہ ٹوپی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے جن
اصحاب نے یہ ٹوپیاں خریدی ہیں وہ بہت پسند کرتے ہیں اور
اپنے احباب سے بھی اس ٹوپی کی سفارش کرتے ہیں آپ ایک ٹوپی منگوا کر
دیکھئے اگر آپ کو پسند آئے تو اپنے دوستوں کے لئے بھی طلب کیجئے
ہر رنگ اور ہر ناپ کی موجود ہیں، قیمت معہ پھندنا صرف محصول
ڈاک علاوہ۔
فرمائشیں آنے کیساتھ سرکا ماپ ضرور آنا چاہئے
عبدالرشید برادر جنرل مرچنٹ انارکلی لاہور

ادیب

جنوری سنہ ۱۹۱۰ء ایک ماہوار رسالہ جسکا عنوان پر درج ہی زبان اردو کی ادبی
خدمات کی غرض سے شائع کیا جائیگا جسمیں ادبی اخلاقی۔ تاریخی۔ تنقیدی اور
دیگر علمی مضامین کے علاوہ ہر مرتبہ ایک رنگین اور چار سادی عکسی تصاویر ہوں
گی، لکھائی چھپائی کاغذ اور ہر قسم کی خوش سلیقگی کیلئے اسیقدر کہنا کافی ہی کہ یہ رسالہ
انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوگا جو اپنی اعلی چھپائی اور صحت کیلئے تمام ہندوستان
میں مشہور ہی ایڈیٹری کیلئے منشی نوبت رائے صاحب نظر منتخب کئے گئے ہین جنہین
اُردو کے نفیس اور ادبی پرچونکی اشاعت مین خاص مہارت ہی تصاویر کا انتظام
دو جرمنی مصوروں کی سپرد ہی جنکی زیر نگرانی نہایت اعلی مشین کام کرتی ہی
مضمون نگاری کیلئے ملک کے نامور اہل قلم نے خاص توجہ مبذول فرمائی
ہی اسطرح یہ رسالہ خاص خوبیونکا مجموعہ ہوگا شائقین علم ادب اور حامیان اُردو
سے درخواست کیجاتی ہی کہ اسکی خریداری کے لیئے دست شوق بڑھائیں
عجلت سے کام لین بڑی تقطیع کافی حجم اور پانچ اعلی درجے کی تصاویر کیساتھ
اسکی قیمت صرف چار روپے (للعہ) سالانہ مقرر ہی مع محصول نمونہ فی پرچہ ۶

المشتہر

مینجر ادیب الہ آباد

ربڑ کی مہر و مہر کنی کا مشہور معروف کارخانہ

راستی موجب رضائے خداست
کس ندیدم کہ گم شد از رہ راست

جناب عالی یون تو ہندوستان میں ربڑ کی مہر اور مہر کنی کے بہت سے کارخانہ ہین مگر یہ کارخانہ عرصہ بیس سال سے نہایت صفائی اور دیانتداری سے کام کر رہا ہے اس کارخانہ نے بڑے بڑے ریسون و حکامون کے بناکر سندین حاصل کی ہیں اور اس کارخانہ میں سب قسم کا کام اور سب زبانون میں یعنی گورمکھی - ناگری - ہندی - بنگلہ - فارسی - عربی - انگریزی - میں بہت صفائی کیساتھ بنایا جاتا ہے اور ہر چیز پر کھدائی بہت عمدہ ہوتی ہے یعنی سونا چاندی - لوہا پیتل پتھر - لکڑی - ان سب پر بہت عمدہ کھدائی ہوتی ہے - اور ہر قسم کے بلاک بھی بہت عمدہ تیار ہوتے ہیں علاوہ اس کے تجارتی نشانیان و ٹریڈ مارک وغیرہ بھی بہت عمدہ تیار ہوتے ہیں اور مونوگرام اور سلطانی طغرائی وغیرہ ولایت کی ذاتی پر بہت عمدہ تیار ہوتے ہین عقیق کی مہرین انگریزی - فارسی - عربی طغرے وغیرہ میں بہت عمدہ کندہ ہوتے ہیں عقیق کی مہر کی قیمت ایک نام کی اعلیٰ درجہ کی معہ انگشتری چاندی کے عار اور معمولی درجہ کی معہ انگشتری چاندی کے [illegible] ربڑ کی مہرین بھی نہایت عمدہ تیار ہوتی ہین جنکی قیمت اعلیٰ درجہ کی عار معہ سامان معمولی درجہ کی [illegible] اور روزمرہ تاریخ بدلنے والی ربڑ کی مہر کی قیمت مع سامان [illegible] اور عمدہ مہر ربڑ کی جو خود سیاہی لیکر چھپتی ہے معہ سامان [illegible] اور ربڑ کی معہ انگشتری چاندی کے بغیر سامان [illegible] والی ربڑ کی مہر [illegible] سامان [illegible] ہمارے کارخانہ میں ہر رنگ کی ربڑ کی مہرین سیاہی [illegible] لگا [illegible]

احمد بیگ مہر کن و ربڑ اسٹامپ میکر چاندنی چوک شہر [illegible]

ویش آپکارک

ہندوستان بھر میں
اکیلا ہفتہ وار
دلچسپ اخبار

ہی جو ہر اتوار کو لاہور سے شائع ہوتا
ہی. قیمت سالانہ ۳ روپیہ ششماہی ۱ روپیہ ۸ آنہ
سہ ماہی ۱۲ آنہ. سال بھر کی پیشگی ادا کرنے
پر ۲ روپیہ کی دوائی نظر ہوتی ہی اگر آپ
نے نمونہ ابھی تک نہیں دیکھا تو یہ بھی کہہ
دیجیے نمونہ مفت بھیجا جائیگا ویش آپکارک دیکھکر
آپ خوش ہونگے

ای ضعف و دیگر امراض برج کے مریضو!

اگر مختلف امراض کا علاج کرا کے مایوس بھی ہو چکے
ہو تو بھی مجھکو صرف ایک کارڈ لکھو میں تمکو دوا مفت تجویز
کرونگا اور ترکیب بتاؤنگا کہ تم پھر سے مرد تندرست
اور جوان بن سکو گے صرف نام مرض اور اپنا نام مفصل پتہ خوشخط
لکھو

پتہ امرت دہارا لاہور

ٹھاکر دت شرما ویدیا لنکار آپکارک کارخانہ امرت دہارا جو کمتی لاہور

اگر

آپ نے رسالہ

آبحیات

رجسٹرڈ جو امرت دھارا
رجسٹرڈ کی تعریف میں ہے ابھی تک
نہ دیکھا ہو تو اس کے منگوانے
کے واسطے لکھ دیجیے گا

غیر معمولی رعایت

مخزن ایجنسی کی طرف سے اپنی قسم کا پہلا اعلان

مخزن کے پڑھنے والوں اور مخزن پریس کی چھپی ہوئی کتابوں کے دیکھنے والوں میں سے کون ایسا ہے جو اس امر سے واقف نہیں کہ مخزن پریس نے عمدہ لکھائی۔ عمدہ چھپائی نفیس کاغذ۔ خوبصورت اور مزین سرورق۔ خوشنما جلدیں۔ ان سب چیزوں کو اپنی خصوصیت بنالیا ہے اور علاوہ دیگر امور کے اس بارہ میں ایک امتیازی شہرت پیدا کی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں بغیر صرف کثیر کے پیدا نہیں ہو سکتیں۔ اور اسی لئے کبھی آج تک اس مطبع کے لئے ممکن نہیں ہوا کہ رعائتی قیمتوں پر فروخت کتب کا اعلان کر سکے۔ جو قیمتیں مقرر کی گئیں وہ اس قدر سوچ سمجھ کر اور نفع کی اسی قدر کم گنجائش چھوڑ کر مقرر ہوئیں۔ کہ ان میں مزید تخفیف محال نظر آئی۔

لیکن بہت سے معزز خریداروں اور دوستوں نے یہ تحریک کی کہ کبھی کبھی۔ ہر سال نہیں تو ہر دوسرے تیسرے سال۔ ایک دن ایسا آنا چاہئے جب دیگر جا بجا اور مطابع کی طرح مخزن کی طرف سے بھی رعایت کا اعلان ہو یہ تحریک بہ وجوہات ذیل ہم نے بھی پسند کی ہے:۔

اوّل۔ مخزن کے چند ہزار خریداروں میں بہت سے صاحب ایسے ہیں کہ وہ ہماری بعض مطبوعات باوجود شائق ہونے کے اس لئے نہیں خرید سکے۔ کہ ان کی توفیق سے زیادہ قیمت کی تھیں۔ یہ رعایت انہیں موقعہ دیگی کہ وہ اب اپنے کتب خانوں میں ان مطبوعات کو [illegible] رکھ [illegible]

ب

دوم۔ بہت سے مدرسے سرکاری اور قومی ایسے ہیں کہ انکے اساتذہ ان کتابوں کو پسند کرتے ہیں اور تقسیم انعام کے لئے یا سکول لائبریری کے لئے انہیں خریدنا چاہتے ہیں لیکن انکے ہاتھ میں محدود رقوم ہیں جنکے سبب سے بہت سی کتابیں خریدنے سے قاصر ہیں۔ انکے واسطے یہ نادر موقعہ ہے کہ وہ ایسی کتابیں جنہیں ڈائرکٹر صاحب سررشتہ تعلیم پنجاب وٹکسٹ بک کمیٹی قابل قدر اور قابل خرید ظاہر فرما چکے ہیں۔ ارزاں قیمت پر خرید لیں۔ تاکہ اس وقت خریدنے سے دس روپیہ میں وہ کام نکلے جو معمولی حالات میں پندرہ بیس روپیہ میں نہ نکل سکیگا۔

سوم۔ عام شائقین جو اکثر اس وجہ سے کہ ہماری کتابوں کا اشتہار دیگر اخبارات میں کم ہوتا ہے۔ ان کتابوں سے بے خبر رہے ہیں۔ اس عام اعلان اور اشتہار کے وقت سستے سے سستے داموں میں مہنگی سے مہنگی جنس حاصل کر سکیں۔

ایسی رعایتوں کے لئے عام قاعدہ یہ ہے کہ ایک دن مقرر کیا جاتا ہے کہ جو درخواستیں اس دن ڈاک میں ڈالی جائیں۔ ان درخواستوں ... جو کتابیں طلب ہوں وہ رعایتی قیمت پر دی جائینگی۔ ہم چونکہ ایسی رعایت اکثر نہیں کرتے اس لئے اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے موقعہ زیادہ دینا چاہتے ہیں یعنی

۸۔ اپریل ۱۹۱۰ء سے ۱۰۔ اپریل ۱۹۱۰ء تک

جو درخواستیں ہندوستان کے کسی ڈاکخانہ سے ڈالی جائیگی ان پر

تینتیس فیصدی

کمیشن ... بر گم

یہ موقع غنیمت ہے

اور اس کو ہاتھ سے نہ دیجیے

تمام درخواستیں بنام منیجر مخزن [illegible] ہی آنی چاہییں

کتابوں کی قیمتیں پوری رکھی گئی ہیں تعمیل کے وقت

۳۳ فی صدی کمیشن کاٹ دی جائیگی

جن کتابوں کی قیمت میں رعایت کی گئی ہے وہ حسب ذیل ہیں

اُردو زبان کا بہترین سفرنامہ

متعدد عنوان فقرہ گوئی بےشمار خیالات اور رایوں کا عطر ہے جو ملک کے معزز اخبارات و نامور
اہل الرائے نے شیخ عبدالقادر صاحب بی۔اے بیرسٹرایٹ لا کی جدید علمی کوشش

مقامِ خلافت یعنی سفرنامہ استنبول

کے متعلق ظاہر کی ہیں۔ اور بالاتفاق یہ بات تسلیم کرلی ہے کہ اس سے زیادہ وضاحت و تفصیل

سے ساتھ دارالسلطنت قسطنطنیہ کے حالات آجتک نہ صرف اُردو بلکہ کسی مشرقی زبان میں لکھے
نہیں گئے۔ شیخ صاحب موصوف کو اپنی سیاحت قسطنطنیہ میں حسنِ اتفاق سے مشہور مقامات کی سیر اور
نقشہ اصحاب کی ملاقات کے جو موقعے میسر آئے جو بڑے بڑے سیاحوں کو مشکل سے نصیب ہوتے
ہیں اسلیے انہوں نے اوّل تو ہر جگہ کے حالات اور ہر ایک بات کے متعلق تفصیلی نوٹ لئے اور اسکے
بعد سفرنامہ کی تحریر میں اپنی مشہور طرزِ ادا کے جوہر اس خوبی سے دکھائے ہیں کہ اصل چیز کا صحیح نقشہ
آنکھوں میں پھر جاتا ہے اور پڑھنے والے کی طبیعت مطالعہ کتاب وہ حظ اُٹھاتی ہے گویا وہ سیر کے وقت
مؤلف کا رفیق اور ہر موقع کے لطف میں شریک تھا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے قریب قریب
ہر باب کے ساتھ ایک ہاف ٹون عکسی تصویر لگائی ہے جسکی وجہ سے چھبیس تصویروں کا ایک مرقع گویا کتاب کے
ساتھ مفت ہاتھ آتا ہے۔ پھر کتاب کی تیاری کا اہتمام بھی قابلِ قدر و لائق دید ہے۔ کتابت نہایت
خوشنما۔ کاغذ اعلیٰ قسم کا چکنا ولائتی۔ تصویریں نفیس آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی اور سب پر طرہ دو سرورق
جو اپنی اپنی جگہ لیتھو کی چھپائی کے نادر نمونے ہیں۔ ایک پر سنہری و روپہلی بیل مع طغرائے شاہی
اور دوسرے پر خوشرنگ انگوری بیل نہایت پسندیدہ ضخامت مع تصاویر تین سو صفحے سے زیادہ
الغرض کتاب ہر پہلو سے ایسی ہے کہ ممکن نہیں جو اسکی خوبیاں دل کو گرویدہ نہ کریں باوجود ان خوبیوں
کے قیمت صرف عہ - دفتر مخزن دہلی سے منگائیے۔

رسومِ دہلی (متعلقہ مسلمانان) از تالیفات مولوی سید احمد صاحب دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ
اس کتاب کی خوبی کے لئے اسکے مؤلف کا نام ہی کافی ضمانت ہے۔ فرہنگ
آصفیہ کے مرتب کرنے سے مولوی سید احمد صاحب نے جو احسان اُردو زبان پر کیا ہے۔ اسکی کافی داد
نہیں دیجا سکتی۔ مولوی صاحب کی معلومات رسومِ قدیمہ کے متعلق حیرت انگیز ہیں۔ اس کتاب میں مؤلف صاحب
نے بچہ کی پیدائش کی معمولات سے لیکر شادی اور میت کی تمام رسومات نہایت شرح و بسط سے لکھی ہیں
زبان عورتوں کی لکھی ہے۔ جو اس قدر پیاری اور دلچسپ ہے کہ کتاب چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا اور بے اختیار
داد منہ سے نکلتی ہے۔ مستورات کیلئے یہ کتاب زیادہ باعث دلچسپی ہے اور اسکا مطالعہ انکے لئے زیادہ مفید اور با مطلب ہے۔

رباعیات اکبر خان بہادر سید اکبر حسین صاحب جج کے کلام نے جو شہرت مقبولیت حاصل کی ہو محتاج توصیف نہیں۔ مخزن پریس دہلی نے حال میں انکی عام اخلاقی رباعیات کا مجموعہ نہایت خوش قلم اور خوشنما چھاپ کر شائع کیا ہو۔ تصحیح پر ایک ایک حرف نہایت اہتمام سے لکھی گئی ہو۔ بہت احتیاط اور صفائی سے چھپی ہو۔ کتاب مجلد ہو اور قیمت صرف ۱۲ علاوہ محصول ڈاک۔

منازل السایرہ یعنی جناب مولوی عبد الراشد صاحب الخیری دہلوی کی مقبول کتاب جس کا پہلا ایڈیشن چھپتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک گیا تھا اور جسکی دوبارہ اشاعت کے متواتر تقاضے آنے ہے۔ اب مخزن پریس میں نہایت خوبی کے ساتھ دوبارہ چھپی ہو۔ اس کتاب میں سایرہ کی زندگی کی مختلف منازل کے حالات نہایت دلچسپ اور نفیس سمت میرطریق سے بیان کیے گئے ہیں۔ مولوی صاحب کی مشہور طرز تحریر کا یہ ایک عمدہ نمونہ ہو۔ اخبارات نے نہایت اچھے اچھے ریویو لکھے ہیں۔ مستورات ہی کی ضرورتوں کو مدنظر رکھکر یہ کتاب لکھی گئی ہو اور اسکا مطالعہ خصوصاً انکے لئے بہت دلچسپ و مفید ثابت ہوگا۔ کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت عمر

مثنویات میرحسن میر حسن کی مثنوی بینظیر بدر منیر کا جو پایہ اردو زبان میں ہو وہ محتاج بیان نہیں اور یہ بے بہا چیز جس طرح غلط سلط بری بھلی چھپکر بازار میں ملتی ہو۔ وہ اس قابل نہ تھی کہ با مذاق اصحاب کی لائبریوں کے لئے باعث زینت ہو اس لئے ضروری تھا کہ سلیس اردو کے اس استاد کامل کی کتاب اچھے لباس اور صحت کے ساتھ چھپی ہوئی شائقین کے روبرو جلوہ گر ہو۔ چنانچہ یہ کوشش بار آور ہوئی اور بہت تلاش سے میر حسن کی دوسری غیر مطبوعہ مثنوی گلزار ارم بھی ایک مستند قلمی نسخے سے نقل کرکے شامل کردی ہو۔ اور ایک نہایت فاضلانہ اور بسیط دیباچہ جناب مولوی سید اشرف حسین صاحب بی۔ اے نے لکھکر اس مثنوی بے نظیر کی داد دی ہو۔ اور اسکی خوبیاں اور دیگر لطیف نکات جو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا نہایت خوبی اور قابلیت سے بیان کئے ہیں۔ قیمت عہ علاوہ محصول ڈاک

خوابِ ہستی

مصنفہ پروفیسر میرزا محمد سعید دہلوی - ایم - اے - ایم - اے او کالج علیگڈھ - ہم یقیناً عام بازاری مخرب اخلاق ناولوں کی اشاعت کے خوف سے اس لئے آپ کو یقین کر لینا چاہئے کہ بصورت اس احتیاط کے جو ناول شائع ہوگا وہ کیسا ہوگا - خواب ہستی کہنے کو تو ناول ہے لیکن دراصل جدید طرز معاشرت کا سچا نقشہ ہے - دور حاضر کے طلبا کی تعلیمی خانگی اور خلوتی زندگی کا بائسکوپ ہے جس میں روزمرہ کے واقعات کو آپ کی چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں - لائق مصنف نے ناول کے رنگین پیرایہ میں زندگی کے ایسے ایسے اہم مسائل بیان کئے ہیں کہ جس سے پہلے کسی ناول نویس نے اس طرف توجہ نہ کی تھی اور اسی پیرایہ میں دکھایا ہے کہ مغربی تعلیم کا اثر نوجوانوں کی طبیعت پر کیا ہوتا ہے جو اپنے مذہب کی ضروری باتوں سے ناواقف رہتے ہیں -

اس ناول میں اور بھی چند خوبیاں ایسی ہیں جو اس کو دوسرے ناولوں سے ممتاز کرتی ہیں - ملک کے تمام اخبارات نے اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے -

اس ناول میں علاوہ دلکھانی چھپائی کے نفیس ہونے کے فسانہ کے متعلق ہی تین ہاف ٹون تصویریں ہیں - جو اس ناول کی زینت دوبالا کرتی ہیں - حجم قریب اڑھائی سو صفحہ ہے **قیمت عہ**

ابو مسلم خراسانی

یہ مخزن التجیسی کا دوسرا ناول - سالم الہلال مصری کے فاضل ایڈیٹر جرجی زیدان کی تصنیف ہے - اس عجیب و غریب ناول میں قرون وسطیٰ کی تدبیر ملکداری سلطنت بنی اُمیہ کی تباہی اور حکومت عباسیہ کی بنیاد کا حال مفصل بیان کیا ہے -

ابو مسلم وہ نامور مسلمان پالیٹشن اور بیمثل مدبر تھا جس نے ایک سعی ناکام کے ساتھ حکمراں رہنے والے خاندان بنو اُمیہ کو غارت کر کے بنی عباس کی خلافت قائم کر دی - افسوس ایسے مدبر کی اردو زبان میں کوئی مکمل سوانح عمری نہیں جس سے اسکے اخلاق و عادات و تدبیر ملکداری کا پورا پتہ چل سکے -

مخزن

کتب خانہ بانکی پور اور اس کا بانی

بانکی پور (پٹنہ) جو صوبہ بہار کا قدیم دارالحکومت ہے اور علم و فضل کے اعتبار سے
ہندوستان کے مشہور شہروں میں چلا آتا ہے۔ اس وقت بھی جب اس کا عروج
مبدل بہ زوال ہو چکا ہے۔ اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اسے ایک بڑا علمی مرکز مانا
جاوے۔ نہ صرف اس لیے کہ اردو فارسی کے چند اعلیٰ درجہ کے ادیب اب تک
وہاں موجود ہیں۔ بلکہ اس لیے کہ علوم مشرقی کی کتابوں کا ایک نایاب خزانہ
کتب خانۂ بانکی پور میں محفوظ ہے۔ ہندوستان کے خزانے بیشتر تو یورپ
کے بڑے بڑے کتب خانوں اور عجائب خانوں کی زینت بن چکے ہیں۔
صرف دو بڑے مجموعے قلمی نسخوں کے موجود ہیں جو دستبرد زمانہ سے بچ رہے
ہیں۔ ایک تو رام پور کا مشہور کتب خانہ جو ریاست ابد دولت رام پور کے
علم دوست والیان ملک کی خاص توجہ اور قدر دانی علوم کی وجہ سے محفوظ
رہ گیا ہے اور بانکی پور کا کتب خانہ۔ جو مرحوم مولوی خدابخش خان بہادر
سی۔ آئی۔ ای۔ اور ان کے والد بزرگوار مولوی محمد بخش خاں کی محنت اور

جہالغفانی کی یادگار ہے۔ گو اس نادر ذخیرۂ کتب کی شہرت یورپ کے علمی حلقوں تک پہنچ گئی ہے۔ تاہم ہمارے ملک میں ابھی بہت لوگ ایسے ہیں۔ جو یا تو اس کے نام سے بے خبر ہیں۔ یا یہ نہیں جانتے کہ کتنی علمی دولت اسمیں بھری پڑی ہے۔ مخزن کے کسی گزشتہ نمبر میں مولوی خدابخش خاں مرحوم کی تصویر شائع کی گئی ہے۔ اِس لحاظ سے کہ ملک و قوم کا یہ محسن اور سچا خدمت گزار اِس بات کا استحقاق رکھتا ہے۔ کہ ملک کے ہر حصے کے لوگ اِس کی بیش بہا خدمات سے آگاہ ہوں۔ کتب خانۂ بانکی پور جسے لارڈ کرزن نے اپنے زمانۂ حکومت ہند میں استعجاب سے دیکھا اور بیساختہ داد دی۔ اپنی موجودہ صورت میں علم و ہنر کے اِسی فدائی کی مدت العمر کی محنت اور کمائی کا نتیجہ ہے۔ گرچہ باعتبار ذخیرۂ کتب اسکی بنا کا سہرا مولوی محمد بخش خاں مرحوم کے سر ہے۔ لیکن اس ذخیرہ کو سنبھالنا۔ اِسکو بڑھانا۔ اِس میں قلمی نسخوں کے علاوہ دیگر کتب مفید جمع کرنا۔ انکی مکمل فہرست تیار کرنا۔ کتب خانہ کے لیئے ایک عالیشان عمارت بنوانا اور یہ سب کچھ تیار کرکے رفاہ عام کے لیئے پبلک کی نذر کردینا یہ سب مولوی خدابخش خاں کا احسان ہے۔ کبھی موقعہ ملا تو مولوی صاحب ممدوح کے حالات زندگی بہ تفصیل ان اوراق میں درج کیے جائیں گے تاکہ خاموشی کے ساتھ علمی ترقی کرنے کی عمدہ مثال طالبانِ ترقی کے سامنے پیش ہو۔ فی الحال صرف اُن چند دلچسپ حالات کا تذکرہ مقصود ہے جو راقم مضمون نے مولوی صاحب موصوف کی خدمت میں دو تین مرتبہ حاضر ہوکر مشاہدہ کیئے۔

جب میں پہلی مرتبہ مولوی خدابخش خاں کی خدمت میں حاضر ہوا تو مولوی صاحب حیدرآباد دکن کی ہائی کورٹ کی چیف ججی سے آئے تھے اور دن رات کتب خانہ کے کام میں ہی مصروف تھے۔ عربی۔ فارسی کتابوں اور اُن کے

معنفین کے متعلق انکی عام واقفیت حیرت انگیز تھی۔ فہرست کتب خانہ تیار کرنے کے لئے انہوں نے اپنے کتب خانہ کے ذخائر کو اس نظر غائر سے دیکھا۔ کہ خود ایک زندہ فہرست بن گئے۔ کسی شایق علم کا ان سے ملنا ان کے لیے عید کا حکم رکھتا تھا۔ گھنٹوں اُسے کتابوں کی سیر کراتے تھے اور نہیں تھکتے تھے۔ کتب خانہ میں بیٹھکر اُن کی باتیں سنتے ہوئے نہایت مشکل یہ پیدا ہوتی تھی۔ کہ آدمی اُن کی ذہانت اور جامعیت کی داد دے۔ یا کتابوں کے مجموعہ اور ندرت کی۔ کتاب بینی کے شوق کا یہ عالم کہ باوجود پیرانہ سالی کے کوئی وقت مطالعہ سے خالی نہ تھا۔ کتابوں کے جمع کرنے کا مذاق اس درجہ پر ترقی کر گیا تھا۔ کہ کسی اچھی کتاب کے حاصل کرنے کے لیے کوئی دقت انہیں مانع نہیں ہوسکتی تھی ایک مرتبہ از راہ ظرافت میرے روبرو انہوں نے یہ فرمایا۔ کہ میں عمر بھر دیانت دار رہا ہوں۔ کیا بہ حیثیت وکیل اور کیا بہ حیثیت جج۔ لیکن اگر میں دیانت داری کا قائل نہیں تو کتاب کے بارے میں۔ اچھی کتاب جس طرح بھی مل سکے ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اس کی مثال ایک ملاقات میں انہوں نے عجیب سنائی۔ کہنے لگے ایک شخص کے پاس ایک قلمی نسخہ موجود تھا جسکی مجھے مدت سے تلاش تھی۔ ہر چند اسے کہا کہ وہ قیمتاً میرے ہاتھ وہ نسخہ بیچ دے۔ وہ راضی نہیں ہوا اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ وہ خود اُس کتاب کا قدرشناس تھا۔ بلکہ وہ بالکل بے علم تھا اور کتاب کی اصلی خوبی سے بے خبر تھا۔ صرف یہ جانتا تھا۔ کہ پرانا نسخہ ہے اور اسکی جلد خوبصورت ہے بے ضرورت کیوں بیچوں آخر تنگ آکر مینے اس سے دیکھنے کے لیے وہ نسخہ مانگ لیا۔ اور اس کی خوبصورت جلد سے اصل کتاب کو جدا کرکے اُس کتاب کی جگہ کوئی اور قلمی کتاب جو اسی تقطیع کی تھی اور اتنی ہی بڑی تھی۔ اس میں جڑوا دی

مالک کی ناواقفیت کی یہ حالت تھی کہ واپس لیتے وقت اس نے جلد کی حالت کو دیکھ لیا۔ کہ اچھی ہے اور خراب نہیں ہوئی۔ اسے خبر بھی نہ تھی۔ کہ جلد کے اندر کیا سے کیا ہوگیا۔ مینے اپنے ضمیر کو یہ کہکر تسلی دے لی۔ کہ وہ شخص اس کتاب کے رکھنے کا اہل نہیں تھا۔ اس لیئے اس سے اس کا چھن جانا ہی اچھا تھا۔ خواہ کسی ناجائز ذریعہ سے ہی ہو۔ بہتر تھا کہ ایسی نادر چیز محفوظ رہے بجائے اس کے کہ ایک بے خبر شخص کے ہاتھوں ضائع ہو جائے۔

مولوی خدابخش خاں باوجود اس کے کہ وہ وکالت میں کامیاب وکلا میں تھے اور ججی میں معقول تنخواہ پاتے رہے۔ بہت ذی ثروت یا صاحب جائداد کثیر نہ تھے۔ اپنی خوشحالی کو انہوں نے کتب خانہ کی خوشحالی کی نذر کر رکھا تھا۔ بچوں کی تعلیم پر صرف کرلیا کرلیا۔ ورنہ باقی جوکچھہ اپنی ضروریات سے بچا اس کارخیر پر لگا گئے۔ ایک مکان رہنے کا کتب خانہ کے قریب چھوڑ گئے ہیں۔ جو کنار دریا واقع ہے۔ اور جس کے چبوترہ سے دریا کا نظارہ کتب بینی کے شایق کے لیے نہایت فرحت افزا ہے۔ ایک دفعہ میں مولنا شبلی نعمانی اور مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب کے ہمراہ مولوی صاحب کے ہاں فروکش تھا۔ اس چبوترہ پر بیٹھے ہوئے ہردو بزرگوار موصوف الصدر مولوی صاحب سے کہہ رہے تھے۔ کہ آپ کا مکان اور اس مکان کا یہ چبوترہ نہایت رشک کے قابل ہے۔ یہاں بیٹھہ کر مطالعہ ایسا لطف دیتا ہوگا۔ کہ اور جگہ ممکن نہیں۔ اپنے علم اور شوق علم کی بدولت مرحوم مولوی صاحب اپنی زندگی میں بھی اقران وامثال میں ممتاز رہے اور انکی زندگی قابل رشک خیال کیجاتی رہی اور پس مرگ بھی ایسی مستقل یادگار چھوڑ گئے ہیں کہ آئندہ نسلیں ان کا نام شکر گزاری کے ساتھہ یاد رکھیں گی۔ مولوی صاحب

اپنے کتب خانہ کے ایک گوشہ میں مدفون ہیں - اور عجب نہیں کہ اُنکی روح ابتک اِس عمارت کے در و دیوار سے محبت رکھتی اور اِس کے زائرین کی آمد و رفت پر خوش ہو رہی ہو گی +

مولوی صاحب کے خلف اکبر مسٹر صلاح الدین خدابخش صاحب بیرسٹر ایٹ لا جو اکسفورڈ کے تعلیم یافتہ ہیں - باپ کے شوق علم سے بہت کچھہ بہرہ اندوز ہوئے ہیں اور کلکتہ جیسے مرکز میں وکالت کے پیشہ کی مصروفیتوں کے باوجود تالیف و تصنیف میں مشغول رہتے ہیں - انگریزی میں ایک سوانح عمری اپنے والد بزرگوار کی لکھہ رہے ہیں - جو اب شائع ہونے کو ہو گی - مولوی صاحب کے منجھلے صاحبزادے جو اِن کے بعد مہتمم کتب خانہ مقرر ہوئے تھے - ملازمت سرکاری میں چلے گئے ہیں اور اب مولوی صاحب کے چھوٹے صاحبزادے محی الدین خدابخش صاحب لائبریرین ہیں - اور نہایت شوق سے کام کر رہے ہیں - اِس زمانہ میں مشہور مستشرق ڈاکٹر راس کے زیر اہتمام ایک فہرست کتب اِس کتب خانہ کی انگریزی میں تیار ہونی شروع ہوئی ہے - جو یورپ کے بڑے کتب خانوں کے نمونے پر کئی جلدوں میں ہو گی - اور جس کی جلد اول تیار ہو چکی ہے جس میں صرف فارسی شاعری کے نسخوں کی فہرست ہے اور وہ بھی فردوسی سے لیکر حافظ تک کی - یہہ فہرست مولوی عبد المقتدر صاحب نے حسب ہدایت ڈاکٹر راس تیار کی ہے - اور مفید معلومات سے پُر ہے - اِس فہرست کی سب جلدیں جب تیار ہو جائیں گی تو کتب خانہ بانکی پور کی سیر کے لیے وہ بہترین رہبر کا کام دے گی - اور معلومات کے وہ گوہر جو کتب خانہ کا مرحوم بانی اپنی گفتگو میں لٹا دیتا تھا - اس فہرست کے ذریعہ شائقین تک پہنچیں گے +

(عبد القادر)

حریت نسواں

(منقول از عصمت)

اس کھوئی کھوائی تعلیم نسواں کا احساس نہ معلوم کس منحوس گھڑی میں مسلمانوں کو ہوا کہ جس وقت سے بزرگان قوم اس طرف متوجہ ہوئے اُس وقت سے آجتک بیسیوں رخنے اور سیکڑوں جھگڑے پیش آ رہے ہیں۔ چند روز تو یہ کیفیت رہی کہ جہاں تعلیم نسواں کا نام آیا اور لوگوں نے کانوں پر ہاتھ رکھا خدا خدا کر کے وہ نفرت کچھ کم ہوئی تو کتابوں پر بوچھاڑ پڑنی شروع ہوئی یہ پڑھنے کے قابل ہے۔ یہ نہیں ہے۔ اسمیں یہ نقص ہے اس میں وہ نقص ہے۔ اب جبکہ یہ زور بھی کچھ کم ہوا تو حریت کا مسئلہ بعض میں چنگاری کا کام کر رہا ہے۔ کئی خاندان ایسے ہیں کہ جہاں تعلیم نسواں کا خاصا اچھا چرچا ہو چلا تھا مگر اس حریت کا نام سنکر وہ سرے سے تعلیم ہی کے مخالف ہو گئے۔ گو اس مضمون پر لکھنا بھڑوں کے چھتہ کو چھیڑنا ہے لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق میں بھی اپنی رائے کا اظہار کروں مگر چونکہ یہ میری ذاتی رائے ہے اس لئے ممکن ہے کہ میں غلطی پر ہوں۔ اگر بہنیں میری اس رائے سے متفق نہ ہوں تو میں اپنی رائے تبدیل کرنے کو تیار ہوں بشرطیکہ وہ معقول وجوہ سے بدلی جائے۔

اس میں کلام نہیں کہ بعض گھرانوں میں عورتوں کے ان جائز حقوق کا لحاظ نہیں ہے جو فطرت اور قانون اسلام نے اُنکو عطا کئے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ جتا دینا بھی میرا فرض ہے کہ خود خواتین ہی اپنے ان حقوق سے لاپرواہ ہوتے ہوتے اسقدر غافل ہو گئی ہیں کہ اب ان میں اس حق تلفی کے احساس کا مادہ نہیں ہے انکی طبیعتیں موجودہ طرز معاشرت کی اس درجہ عادی ہو گئی ہیں کہ اگر انکے حقوق کا لحاظ

کیا جائے جس کا اثر ان کی روزمرہ زندگی پر پڑے تو شاید اکثر بیویوں کو خوشگوار ہونے کے بجائے اُلٹا ناگوار ہو مثلاً یہ خیال اگر صحیح ہو کہ پردہ کی موجودہ سختی اسلام کی شان سے بعید ہو اور شارع نے عورتوں کو یہ اختیار دیا ہو کہ وہ ضرورت سے باہر نکل سکیں سودا سلف خریدیں - مردوں سے بات چیت کریں تو بھی میں سمجھتی ہوں کہ بہت سی عورتیں اور کچھ اگلے ہی زمانہ کی نہیں آجکل کی بھی شاید مردوں سے کھُلم کھلا بات کرنا پسند نہ کریں گی -

ایسی حالت میں اِس کمی کا احساس اِس طرح پیدا کروانا اور ان حقوق کا جن کے قایم نہ رہنے سے کوئی نمایاں[۱] نقصان نہیں - اِس طرح مطالبہ کرنا انگوشت دنیا یا ایک ایسی ترغیب دینا ہے جو انہیں آئے دن کے جھگڑوں میں ڈال کر انکی زندگی تلخ کردے +

اِن خاص خاص خاندانوں کو چھوڑ کر جہاں بیوی سے مراد محکوم ہے عام طور پر پڑھے لکھے آدمی حقوق نسوان پر خاص طور سے متوجہ ہیں اُنکی بیویاں چار دیواری کے اندر ملکہ ہیں سفید و سیاہ کا اختیار بچوں پر پوری حکومت ملنے جلنے کے کامل اختیارات اور روپیہ پیسہ کی قطعی مالک

اِن دو قسموں کو چھوڑ کر ایک تیسری قسم کے خاندان بھی ہیں جو اِن دونوں حالتوں کے بیچ بیچ چل رہے ہیں - اِن گھروں میں بیویاں گو پوری آزاد نہیں لیکن قید بھی نہیں ہیں - روپیہ پیسہ کے معاملات میں اُنکو صرف کے کلی اختیارات ہیں اس شرط پر کہ وہ اس کا حساب کہیں اُنکو دوسروں کے ہاں جانے دوسروں کو اپنے ہاں بُلانے میں کوئی روک ٹوک نہیں - اگر وہ درخواست کریں - اُنکو خاوندوں کی اگر شکایت ہے تو صرف اتنی کہ ساس نندوں کا دباؤ اُنکی زندگی بےچین کر رہا ہے

[۱] نمایاں نقصان پر ایک مفصل بحث کی ضرورت ہے جو کبھی آیندہ دیکھی جائیگی - ۱۲

ہر وقت کی سوختنی اور ہر دم کے طعن تشنیع بلا وجہ انکی تکالیف کا سبب ہیں ÷
انکو حریت کی ڈور پر لگانا اس میں شک نہیں کہ انکے دلوں کو فتح کر لینا ہے
ایسے شخص سے زیادہ (جو اس موقعہ پر انکی جھوٹی سچی ہمدردی کرے انکو بتاے کہ
مردوں نے تمہارے حقوق غصب کر لیے انکو ترغیب دے کہ وہ لڑ کر جھگڑ کر
بگڑ کر بگڑا کر اپنے حقوق حاصل کریں) کون عزیز ہو سکتا ہے خیر خواہ ہے تو وہ دوست
ہے تو وہ کتاب ہے تو وہ رسالہ ہے تو وہ اخبار ہے تو وہ المختصر اگر کچھ ہے تو وہ اور صرف
وہ جو ایسے موقعہ پر یہ کہے کہ قدرت نے جو کچھ تم کو دیا تھا تمہارے مردوں نے
زبردستی چھین لیا۔ تمہارے گلوبند گلے کے طوق ہیں تمہاری زندگی نہیں غلامی ہے
لیکن میرا خیال (ممکن ہے کہ غلط ہو) یہ ہے کہ بجاے ان بہنوں کے بھڑکانے
اور اکسانے کے اگر ان کے خاوندوں سے یہ درخواست کیجاے تو زیادہ بہتر ہوگا
ہم کو تمہارے افضل ہونے میں انکار نہیں۔ فکر معاش میں جو تکلیفیں اور مصیبتیں
تم کو اٹھانی پڑتی ہیں۔ ہم اسے اچھی طرح دیکھتے اور جانتے ہیں۔ گو تمہاری گاڑھی
پسینہ کی کمائی تمہاری محنت و مشقت سے پیدا کی ہوئی آمدنی ہم بے غل و غش
خرچ کرتے ہیں۔ مگر ہمارے دل تمہاری اس پریشانی سے جو تم نے اس دولت
کے حاصل کرنے میں اٹھائی ہے آگاہ ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہم تم کو اس
انقلاب کی طرف بھی متوجہ کرتے ہیں جو شادی نے ہماری حالت میں کیا
وہ بےفکری کا زمانہ جبکہ ماں باپ کے گھر اپنی نیند سوتے اور اپنی نیند اٹھتے تھے
آج ہم سے کوسوں دور ہوگیا۔ ماں جیسی نازبردار جو گھڑیوں اور گھنٹوں منت خوشامد
کر کے کھانا کھلاتی تھی علیحدہ ہوئی اور باپ جیسا شفیق جو ہمارے پھانس
لگنے سے بیچین ہوتا تھا جدا ہوا۔ تم نے ہم کو محبت کے وعدوں اور خوش
رکھنے کے اقراروں پر ان عزیزوں کی آنکھ سے اوجھل کر دیا جن کی ہمارے

چین و آرام کے ساتھ جا میں لڑی ہوئی تھیں وہ جان چھڑکنیوالے جنکا ہمیں دیکھہ دیکھکر چلوؤں خون بڑھتا تھا ہم سے چھوٹ گئے۔ تم ہماری سرتاج ہو مگر ہمکا بھی تو دیکھو ہم نے کیسے کیسے عزیز تم پر سے قربان کر دیئے منصف مزاج خاوند! انسان ہونیکی حیثیت سے ہم تم دونوں یکساں اور میاں بیوی ہونے کے لحاظ سے غم و رنج میں برابر کے شریک ہیں۔ ہماری تکلیفوں پر بھی نظر ڈالو۔ قدرت نے ہم کو جو کچھہ عطا کیا تھا وہ ہم تم پر سے لٹا بیٹھے اور زبردستی تھیں ہنسی خوشی اور راضی رضا۔ گھر لائے کی آج کہو اور وہ وقت یاد کرو جب ہمارے پیاروں سے تڑا اپنے قبضہ میں لائے اور آج جبکہ ہما ڈھانچ رہ گیا ہم سے طوطے کی طرح دیدہ سے نہ بدلو۔ دن بھر کی محنت و مشقت کے بعد تمہیں رات کو چین ملجاتا ہے لیکن ہماری تقدیر میں وہ بھی نہیں۔ آنکھیں دکھتے بچے بخار چڑھے بچے رات رات بھر ٹہلاتے ہیں۔ ہماری کوشش یہہ ہوتی ہی کہ تمہاری آنکھہ نہ کھل جائے ہمارا ساری ساری رات اور پورے پورے دن کندھے سے لگائے ٹہلنا بہت بڑے رحم کا مستحق ہے۔

ہم نے تمہارے بچوں کے پالنے میں اپنی جوان جان قربان کر دی جب آج یہہ پہلو اسے بچے اچھلتے کودتے دکھائی دے رہے ہیں "سارا جوبن گھا تو جب ایک لالہ پالو" جن مشکلوں کا ہمیں سامنا ہوا جو جو آفتیں ہم نے بھگتیں اور جیسی جیسی مصیبتیں ہم نے جھیلیں ان پر غور کرو اور پھر انصاف سے دیکھو کہ ہم کس سلوک کے مستحق ہیں تمہاری بیماری کے آگے ہم اپنی بیماری بھولیں تمہارے دکھہ میں ہمیں اپنا دکھہ یاد نہ رہے ہمیں بخار ہو ہمارے سر میں درد ہو مگر ہم تمہارا آرام مقدم سمجھیں۔ تم سے پہلے کھانا قسم تم سے پہلے سونا گناہ تم سے بہتر کھانا حرام آخر ہم بھی انسان ہیں۔ ماں باپوں کی بیٹیاں بھائیوں کی بہنیں ہم بھی ہیں نازونعم سے پلے ہاتھوں چھاؤں بڑے ہم ہی ہیں جنکو اندھیری کوٹھری میں جاتے ڈر لگتا تھا اور آج ڈھنڈار گھر میں جب

بچہ بچہ پڑا سوتا ہے آدھی آدھی رات تک تمہارے واسطے کھانا لیے بیٹھے رہتے ہیں ہم بیچارے نہیں وارث دار ہیں۔ اب بھی ایسے ایسے حمایتی موجود ہیں کہ اگر اڑتی سی خبر سُن لیں تو ہمارے پسینہ کی جگہ خون بہا دیں۔ مگر نہیں ہم جو کچھ کر رہے ہیں فرض سمجھکر اور واجب جانکر ہماری حالتوں پر غور کرو۔ اور عقل سے کام لو۔

میں سمجھتی ہوں کہ یہ تجویز حریت سے زیادہ کارگر ہوگی میں بہنوں کو یہ صلاح دینے پر آمادہ نہیں ہوں کہ وہ خواہ مخواہ کے جھگڑے پیش کر کے بدنام ہوں انکو سمجھ لینا چاہیئے کہ جب گھی سیدھی انگلیوں سے نکلے تو ٹیڑھی انگلیاں کرنی بالکل فضول کیا وہ عورت جو حریت کے شوق میں میکے بٹھوا دی گئی اس بات پر ناز کر سکتی ہے کہ اُس نے اپنے حقوق حاصل کر لئے۔ ضرورت یہ ہے کہ میاں بیوی اپنی آیندہ زندگی ہنسی خوشی سے بسر کریں اور جہانتک ممکن ہو کسی قسم کی کشمکش درمیان نہ آنے دیں۔ انکو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ وہ مسلمان ہیں انکا مذہب اسلام ہے اور حالانکہ اسلام نے عورت کی حمایت ہر مذہب سے زیادہ کی لیکن وہ منصف کتاب جسکو خدا کا کلام یقین کر رہے ہیں یہ فیصلہ کر رہا ہے کہ اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَی النِّسَآءِ مردوں کو فضیلت دی عورتوں پر اس کے ساتھ ہی قانون اسلام نے دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کے برابر تسلیم کیا ہے مجھے افسوس ہے کہ میرا یہ مضمون بعض بہنوں کو ناخوش کر دیگا۔ مگر مجھے امید ہے کہ عصمت اُن کے گھروں میں دیا سلائی کا کام نہ کرے گا عصمت اس غرض سے اُن کے مطالعہ میں نہ جائیگا کہ انکی زندگی برباد اور تلخ کر دے عصمت اُن کے جائز حقوق کی ہمیشہ حفاظت اور حمایت کرے گا اور عصمت کی کوشش یہ ہوگی کہ وہ دین اور دنیا دونوں میں عزت و حرمت سے زندگی بسر کریں ✣

علم ادب

(سلسلہ کے لئے دسمبر ۱۹۰۹ء کا پرچہ ملاحظہ ہو)

اب میں اس سوال پر غور کرنا چاہتا ہوں کہ ادب کا نصاب تعلیم میں کیا رتبہ ہونا چاہیئے۔ پچھلے سال کیمبرج میں جو ۹۵ لکچر دیئے گئے ان میں سے دس علم ادب پر تھے۔ ہماری اپنی سوسائٹی کے ۱۳ لکچروں میں سے سات علم ادب سے تعلق رکھتے تھے۔ ایسی حالت میں یہ دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ نصاب تعلیم میں ادب کا یہ رتبہ بہت ہی معقول اور تسلی بخش ہے۔ جب مجھکو یہ علم ہوا کہ مجھے آج آپکے رو برو لکچر دینا ہے تو میں نے سکاٹلینڈ اور شمال کے مشہور و معروف صنعتی مرکزوں میں اس امر کے متعلق تحقیقات شروع کی کہ ادب بلحاظ مضمون درسی کسقدر پسند کیا جاتا ہے۔ اس تحقیق کا نتیجہ میرے امید کے مطابق نکلا۔ پروفیسر صاحبان کلہم ایک ہی داستان سناتے ہیں اور وہ یہ کہ عام لوگوں کے دلوں میں ایسے مضامین کا شوق پیدا کریں جو روزمرہ کی زندگی کے عملی کاموں سے تعلق نہیں رکھتے۔ حالانکہ یہ نہایت ہی مشکل امر ہے۔ رجحان طبائع اس کے خلاف ہے کہ ادب کو ادب کی خاطر پڑھا جاوے یا کسی ایسے مضمون کے مطالعہ میں وقت صرف کیا جاوے جس کا زندگی کے روزمرہ کام پر براہ راست کوئی معتد بہ اثر نہیں پڑ سکتا۔ زیادہ سے زیادہ ادب کا شوق جو پایا جاتا ہے وہ اس حد تک ہے کہ تاریخ کا مطالعہ ہو اور اس کے ساتھ مروجہ پولیٹکس کی کچھ چاشنی لگی ہوئی ہو۔ القصہ ادب کے مطالعہ کا شوق بہت ہی محدود ہے۔ یہ رائے سب تجربہ کار لوگوں کی اور ہم سب کو اسے تسلیم کرنا چاہیئے اور کسی طرح سے بھی اس پر متحیر نہ ہونا چاہیئے۔

کچھ سال ہوئے مسٹر گوسچن صاحب نے ایک تقریر میں یہہ فرمایا تھا کہ تین اغراض ہیں جنکی خاطر لوگ اعلی تعلیم کے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اوّل روٹی کمانے کے لیے زیادہ وسائل بہم پوہنچائیں اس لحاظ سے سائنس بہت سے لوگوں کی معاش کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ دوئم تمدن۔ تاریخ اور ایسے واقعات میں جو روزمرہ کی زندگی اور پولٹیکل کام سے تعلق رکھتے ہوں زیادہ دسترس حاصل کریں۔ سوئم علم کو شوقیہ پڑہیں تاکہ اس سے زندگی میں لطف پیدا ہو اور فانوس خیال روشن ہو۔

دنیاوی لحاظ سے اگر دیکھا جاوے تو تیسری غرض کسی حد تک قابل اعتراض معلوم ہوتی ہے اور اس سے خود پرستی میں انہماک اور محض تخیلانہ زندگی بسر کرنے کا شوق پایا جاتا ہے۔ آجکل علم طبعی میں بہت کچھ ترقی ہو رہی ہے اور وہ وقت قریب آنیوالا ہے جبکہ علمی تگ و دو کے میدان میں علم طبعی سب سے آگے بڑھ جائیگا جس بے رحمی اور سنگدلی سے زمانہ گذشتہ میں علم ادب نے سائنس کے تعلقات میں کام لیا ہے۔ کچھ تعجب نہیں کہ اب سائنس بھی اپنی نوبت میں انتقام لے اور علم ادب کو نیچا دکھاوے۔ سائنس اور علم ادب کے متقابل دعاوی پر ڈاکٹر ارنلڈ صاحب کی رائے ذیل میں نقل کرتا ہوں:۔

> اگر کوئی طالب محال ہو سکتا ہے تو میری یہ آرزو ہے کہ میری اولاد علم طبعی میں خوب ماہر ہو مگر ساتھ ہی اخلاقی مضامین سے بھی کامل طور پر بہرہ اندوز ہو۔ مگر چونکہ سائنس اور لٹریچر کا یہ اجتماع ناممکن ہے اسلئے میری یہ خواہش ہے کہ بجائے سائنس میں کمال حاصل کرنے کے۔ سائنس میں سے انہیں صرف اسقدر یاد ہو کہ سورج زمین کے گرد چکر کھاتا ہے اور ستارے موتی ہیں جو نیلگوں آسمان میں جڑے ہوئے ہیں

یہ کافی ہو کہ انسان ان باتوں کو جانتا ہو گو واقعی اُس کا عقیدہ یہ نہو
کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے۔ لیکن اگر سائنس اور علم ادب میں
تفریق ہی ضروری ہو تو کم از کم ہیں ان مبالغہ آمیز دعاوی کو جو
حامیان سائنس پیش کرتے ہیں ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں
کہ سائنس تعلیم کی ابتدا اور انتہا ہے +

علاوہ بریں یہ ہم جانتے ہیں کہ آجکل صنعتی اور تجارتی تعلیم کا بول بالا ہے۔
ہمارے ملک اور زمانہ کی خاص حوائج ہم کو مجبور کرتی ہیں کہ اُس مضمون کی
طرف ضرور توجہ مبذول کی جائے یہ تعلیم بذات خود بمنزلہ بیوپار کے ہے اور
یہ ممکن نہیں کہ ہم اس اعلیٰ صنعتی اقتدار کو جو ہمیں حاصل ہے معہ اُن لوازمات کے
جنکا اسپر انحصار ہے۔ قائم رکھ سکیں جب تک کہ ہم صنعتی تعلیم کو حتے المقدور رواج
دینے کی کوشش نہ کریں۔ مگر ایک تیسرے قسم کا بھی علم ہے جو اپنے لحاظ سے بمنزلہ
ایک کاروبار کے ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمدردانہ خیالات اور قوت متخیلہ کو ترقی
دی جاوے۔ روحانی جذبات کو تیز کیا جاوے اور اخلاقی نگاہ کو وسعت دیجاوے
موجودہ تعلیم بے شک طریق حصول میں باقاعدہ (سائنٹفک) ہے لیکن ایک
طرف تو وہ عقل پر اور دوسری طرف مفاد ذاتی اور خود پرستی پر مبنی ہے۔
اُس کے اس بڑے نقص کو دور کرنے کے لیئے یہ ضروری ہے کہ کوئی ایسا
مجرب نسخہ تجویز کیا جاوے جس سے کہ مقصود اعلیٰ ہمیشہ ہماری پیش نظر رہے
یہی مقصد اور مدعا لٹریچر کا ہے محض علم ادب سے انسان شریف یا اچھا فرد
جماعت نہیں بن سکتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ محض علم و فضل طالبان حق سے غرور
بغض۔ نخوت۔ تکبر یا اور اسی قسم کے نقائض دور نہیں کر سکتے۔ اور نہ وہ انسان
کی طبیعت کو نفسانی خبائث سے پاک و منزا کر سکتے ہیں۔ اور نہیں یہ کہنے کو تیار ہوں

لٹریچر زندگی اور عمل کا نعم البدل ہو سکتا ہے۔ برک نے سوال کیا ہے کہ عام طور پر دنیا کی تعلیم کیا ہے۔ چند کتابوں کا پڑھنا ہی نہیں۔ برخلاف اس کے ضبط نفس قوت منتظمہ نیکی اور انصاف دنیا کی تعلیم کے جزو اعظم ہونے چاہییں۔ یہ قول بالکل سچا ہے۔ سب سے بڑا معلم خود زندگی ہے۔ لیکن چند منتخب اور عمدہ کتابوں کے پڑھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہم میں تربیت پیدا کرتی ہیں۔ اور نیکی اور انصاف کا شوق دل میں جاگزیں کرتی ہیں۔ ہماری روحانی قوتوں کو بیدار کرتی ہیں اور ہم کو احساس کراتی ہیں ان خوبیوں کا جو ہم میں اور دیگر بنی نوع انسان میں ہوتی ہیں۔ عملی طور پر اگر دیکھا جاوے تو یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ مروجہ تعلیم ہماری روحانی قوتوں کو واقعی بیدار کرتی ہے۔ جو کتابیں کتب خانوں سے پڑھنے کے لیے لائی جاتی ہیں۔ وہ اکثر اعلیٰ قسم کی نہیں ہوتیں۔ اعداد شمار پیش کر کے میں آپ کا وقت نہیں لینا چاہتا لیکن جو امر سچے شائقین کتب پر شاق گزرتا ہے یہ ہے کہ ان کتب میں سے اکثر کتابیں ناول ہوتے ہیں۔ شمال کے ایک بڑے شہر میں ایسی کتابوں کا اوسط ۷۶ فیصدی ہے۔ ایک دوسرے شہر میں ۸۲ فیصدی تیسرے میں ۸۴ اور چوتھے میں ۷۶ فیصدی ہے۔ ریاستہائے متحدہ کے کتب خانوں سے جس قسم کی کتابیں پڑھنے کے لئے لی جاتی ہیں۔ ان کے متعلق بھی میں نے تحقیقات کی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے لوگ ہم سے کسیقدر زیادہ سنجیدہ مذاق ہیں۔ جہاں ہمارا اوسط ۷۰ فیصدی ہے۔ وہاں شکاگو جیسے شہر میں ان کا اوسط ۶۴ فیصدی ہے۔ سکاٹلینڈ میں بھی ناول پڑھنے کا شوق اسقدر نہیں جسقدر کہ انگلستان میں وہاں کے باشندے بمقابلہ اہل انگلستان زیادہ ذوق سلیم رکھتے ہیں اور اسکی وجہ مجھے یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہاں لٹریچر کے پروفیسر بڑے بڑے

قابل برگزیدہ اشخاص ہوتے ہیں اور اُن کے لکچر عام اور پرشوق سے سنے جاتے ہیں۔ انگلستان میں یہ نہیں ہے اور اسی وجہ سے انگلستان میں ناول پڑھنے کا رواج زیادہ ہے +

میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ناول پڑھنے سے پرہیز کیا جاوے۔ یا یہ کہ ناول بالکل کارآمد نہیں ہوتے۔ برخلاف اس کے اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے کہ سارے دن کی تکان اور محنت کے بعد لنڈن والٹر سکاٹ۔ میریڈیتھ۔ تھیکرے ڈکنس یا کسی دوسرے زندہ مصنف کے ناول شوق اور مزے سے پڑھے میں خود ناول پڑھنے کا حد سے زیادہ مشتاق ہوں۔ اس لیے جب میں یہ کہتا ہوں کہ علمی دلچسپی کے مضامین میں ناول کا حصہ بہت زیادہ ہے تو میری مراد یہ نہیں ہوتی کہ یہ کوئی عیب ہے جس کو کم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ میرا منشا صرف اتنا ہے کہ یہ تناسب بہت زیادہ ہے اور بہتر ہوگا اگر اس کا اوسط چالیس فیصدی تک کم کیا جائے اور سنجیدہ کتب کو پڑھنے کا شوق ۱۳ فیصدی سے ۲۵ فیصدی کی حانک پونہچ جاوے +

لٹریچر کے متعلق اہل انگلستان کے خلاف اور بھی شکایات ہیں۔ کچھ دن ہوئے میں اپنے کالج آکسفورڈ کے مشہور و معروف قابل پرنسپل مارک پٹیسن کا جو کتابوں کا سچا عاشق تھا۔ ایک مضمون اس بارہ میں پڑھ رہا تھا۔ اُن کو شکایت ہے کہ ایک معمولی انگریزی گھرانے میں کتب فروش کا بل اسقدر تھوڑا ہے کہ اُس کا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اُنکی رائے میں اس سے زیادہ اور کوئی امر شرمناک نہیں کہ جس شخص کی سالانہ آمدنی ہزار پونڈ ہو۔ وہ ہفتہ میں کتابوں پر محض ایک پونڈ خرچ کرے یا یوں کہئے کہ وہ سال بھر میں ایک پونڈ پیچھے ایک شلنگ سے بھی کم خرچ کرے۔ آپ کو معلوم ہے کہ صاحب مدارالمہام

خزانہ ہم سب سے ۸ یا ۶ پنیں فی پونڈ بطور انکم ٹکس لیتے ہیں اور میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس رقم کو ایسے ہی صحیح و معقول مصرف پر لگاتے ہیں جیسا کہ ہم اگر ہم اسی روپیہ کو کتابوں پر خرچ کریں۔ بہر حال فی پونڈ ایک شلنگ کا خرچ کتابوں پر ایک ایسے کلرک کے لیے جو دو سو پونڈ سالانہ کماتا ہے یا ایک ایسے محنتی کے لیے جو چالیس پونڈ سالانہ کماتا ہے۔ میری رائے میں بہت ہی کافی اور معقول ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ انسان کے پاس بہت سی کتابیں ہوں مثلاً پیسین کا قول ہے کہ ہر ایک خود دار انسان کے پاس کم از کم ہزار کتابیں ہونی چاہئیں۔ اور وہ یہ بھی فرما گئے ہیں کہ یہ ہزار کتابیں ایک ایسی الماری میں رکھی جاتی ہیں جو ۱۲ فٹ لمبی اور دس فٹ چوڑی اور ۶ - انچ گہری ہو۔ ایک معمولی حیثیت کا آدمی بھی ایسی الماری مہیا کر سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہو کہ لوگوں کے پاس بہت سی کتابیں ہوں بلکہ اس بات کو یاد رکھنا چاہئیے کہ جو کتابیں ہوں وہ منتخب کتابیں ہوں۔ اور دلچسپی سے پڑھی جائیں۔ حاضرین آپ یہ سنکر افسوس کرینگے کہ بہت سے ممتاز اور معزز گھرانے ہم میں ہیں جہاں ایک عمدہ اٹلس یا ایک عمدہ ڈکشنری یا ایک عمدہ لغت کی کتاب بھی نہیں مل سکتی۔ اس سے زیادہ قابل افسوس یہ امر ہے کہ جن گھرانوں میں کتابیں ہوتی ہیں ان انکو بالکل ہاتھ بھی نہیں لگایا جاتا۔ یہ نہایت ہی شرمناک امر ہے بالخصوص اسلئے کہ کوئی شخص جو زمانہ کے واقعات میں کچھ دلچسپی لیتا ہے ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ روزانہ ٹائمز کو پڑہے اور پہر اسمیں اُسے کوئی ایسا لفظ نہ ملے جسکو سمجھنے کے لیے اسکو ڈکشنری یا لغت کی ضرورت نہ پڑے۔

کوئی دانا آدمی ایک منٹ کے لیئے بھی یہ فرض نہیں کر سکتا کہ ہر ایک شخص کو

فطرتاً کتابوں کے استعمال یا اُن کے مطالعہ کی قابلیت ملی ہوئی ہوتی ہے یقیناً ہر ایک شخص میں فطرتاً ایک بڑا فاضل بننے کی لیاقت ودیعت نہیں ہوتی۔ جسطرح کہ مینڈل اور بیتھوون جیسے گویے۔ عام شخص پیدا نہیں ہوتے سیطرح گبن اور نبٹلے کی طرح عالم ہر شخص نہیں ہو سکتا۔ برخلاف اِس کے بہت سے آدمی ایسے ہوتے ہیں جن میں مطالعہ کا مادّہ ہی نہیں ہوتا جس طرح کہ اکثر ایسے اشخاص ہوتے ہیں جن کو سُروں میں تمیز کرنی نہیں آتی۔ میرا روئے سخن ایسے لوگوں سے ہرگز نہیں۔ اُن کے لیے روزانہ اخبار ہی اسقدر زیادہ ہے کہ وہ بمشکل سرسری طور پر پڑھ سکتے ہیں۔ علاوہ بریں میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ جسطرح پیدا ہوتے ہی انسان میں اعلیٰ نیکیاں نہیں آتیں اسیطرح اس میں پیدا ہوتے ہی سوچ۔ غور و خوض اور یکسوئی سے مطالعہ کرنے کی قابلیت اور عادت نہیں آسکتی۔ جو امر کہ میں آپ کو ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایک نوجوان مرد یا عورت کے لئے جس کو خانگی امور سے فرصت ہو۔ کم از کم نصف گھنٹہ دن میں سے خاص مطالعہ کے لیئے نکال لینا کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے جسکو عمل کرنے کے لئے فوق الانسان قوت ارادی درکار ہو بعض کہینگے کہ یہ بہت مشکل ہے اور میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ اِس حجت کو سب سے اوّل پیش کرنے والے وہ شخص ہونگے جو اپنا وقت دل کھولکر ضائع کرتے ہیں۔ بہر حال اگر نصف گھنٹہ زیادہ ہو تو چوتھائی گھنٹہ ہی سہی۔ میری اپنی رائے ہے کہ نصف گھنٹہ میں آپ برک کے چالیس صفحے یا ورڈسورتھ کے استادانہ کلام میں سے ایک مکمل نظم مثلاً اشعار لنڈن یا الیڈ یا انیڈ کا تہائی اصل یا ترجمہ بخوبی پڑھ سکتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ میں نصف گھنٹہ میں بہت کچھ بھر رہا ہوں۔ مگر آپ کوشش کرکے دیکھیں کہ آپ نصف گھنٹہ میں کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ پھر اس نصف گھنٹہ کو ۳۶۵ سے ضرب

دیویں اور سوچیں کہ اختتام سال تک کتنے خزانے علوم کے آپنے جمع کر رکھے ہونگے اور اپنی آیندہ زندگی کے واسطے کتنے سامان خوشی حوصلہ اور دانائی کے آپ نے اکٹھے کر لیئے ہوں گے +

میں آپکا قیمتی وقت ان بعض عملی تدابیر و تجاویز کے ذکر سے نہیں لینا چاہتا جن سے کہ مطالعہ میں بہت کامیابی اور مدد ملتی ہے۔ جو صاحب کتابوں سے بہت کچھ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں وہ ان کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے بہت اشخاص علم کو روپیہ کی مانند خیال کرتے ہیں۔ وہ علم کو اکٹھا تو کرنا چاہتے ہیں مگر اس ثابت قدمی و ایثار نفسی کے لیئے تیار نہیں ہوتے جو اسکے حصول کا لازمی جزو ہیں۔ دانا طالب علم کو چاہیئے کہ پڑھتے وقت اپنے ہاتھ میں قلم یا پنسل رکھے اور جسقدر ہو سکے خلاصہ بنانے کی زحمت گوارا کرے۔ سر ولیم ہمیلٹن مطالعہ کی کتابوں میں نشانات لگانے کا بڑا حامی تھا وہ لکھتا ہے۔ سوچ سمجھکر نشان لگانے سے ایک ضروری کتاب کا خلاصہ تیار ہو جاتا ہے اور نشانات مختلف قسم کی پنسلوں سے لگائے جاویں تاکہ بلفظ مضمون کا پتہ چل جاوے اور دلائل کے اصولی حصوں کی تواریخی یا فروعی حصوں سے تمیز ہو سکے تو وہ خلاصہ ایک نقشہ بن جاتا ہے جس سے کہ ہر وقت مدد لی جا سکتی ہے۔

اس تحریر میں یہ فرض کیا گیا ہے کہ کتاب جسمیں نشان لگائے جاتے ہیں۔ وہ پڑھنے والے کی اپنی ہے۔ علاوہ ازیں یہ ایک نصیحت کا ایسا خلاصہ ہے جس پر کاربند ہونا تقریباً محال ہے بعض بڑے ادیبوں مثلاً گبن۔ وبسٹر۔ اور لارڈ سٹرافورڈ کا یہ قاعدہ تھا کتاب پڑھنے سے پہلے وہ ایک مختصر سا خلاصہ ان سوالات کا بناتے تھے جنکا جواب وہ سمجھتے تھے کہ اس کتاب میں مل سکتا ہے۔ اور جس سے کہ ان کی معلومات میں ایک قابل قدر اضافہ ہو سکتا ہے گبن لکھتا ہے :-

کسی نئی کتاب کی فہرست مضامین پر سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد میں اسکا مطالعہ

نہیں کرتا تھا جبتک کہ میں ہر ایک مضمون کے مختلف پہلوؤں کے متعلق خود نہ سوچ لیتا تھا جو کچھ کہ میں نے مضمون کتاب یا اس کے کسی خاص حصہ کے مضمون کے متعلق پڑھا یا سمجھا یا سنا یا خیال کیا تھا۔ اپنے ذہن میں اکٹھا کر لیتا تھا اس سے مجھے یہ پتہ چل سکتا تھا کہ مصنف میری اصلی معلومات میں کیا اضافہ کر سکتا ہے۔ اور اگر کبھی کبھی مجھے یہ خوشی حاصل ہوتی تھی کہ مصنف کی رائے میرے موافق ہے تو کبھی کبھی یہ بھی احساس کرنا پڑتا کہ مصنف میرے خلاف ہے۔ میں نے کئی دفعہ اس قاعدہ کے مطابق مطالعہ کرنے اور اپنی توجہ کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے اور میں اس طریقہ کی آپ سے سفارش کرتا ہوں اگر آپ اسپر عمل کرینگے تو آپکو معلوم ہوگا کہ کئی کتابیں ایک دفعہ نہیں دو دفعہ پڑھنے کے قابل ہوتی ہیں۔ اور بالخصوص جو کتابیں کہ استادانہ امتیاز رکھتی ہیں وہ ہزار ہا دفعہ پڑھنے کے قابل ہوتی ہیں۔ یہ خیال کرنا سخت غلطی ہے کہ چونکہ آپ نے کسی استادانہ تصنیف کو ایک یا دو دفعہ پڑھ لیا ہے۔ اسواسطے آپکو اس کے آئندہ پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ برعکس اس کے قاعدہ یہ ہونا چاہیے کہ جو مستند تصنیف ہے اس کو انسان ہر وقت ورد زبان رکھے اور اسکو اپنی روزانہ زندگی کا ایک جزو قرار دے۔

دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ ایک معمولی نوٹ بک تیار رکھیں اور جو کوئی عمدہ۔ دلچسپ یا قابل قدر مضمون ملے۔ اسمیں درج کر لیا جائے۔ لوک نے اس کے متعلق یہ لکھا ہے کہ اگر آپ نوٹ بک سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو آپ ہر ایک اندراج کو کسی سرخی کے تحت میں درج کریں۔ یہ نصیحت بہت ہی اعلیٰ ہے اور اسپر کاربند ہونے سے آپ اپنے خیالات کو کسی فقرہ پر جما سکتے ہیں اور اسکے اصلی مقصد و معانی کو ذہن نشین کر سکتے ہیں مگر گبن جیسے مستند عالم کی رائے اس کے خلاف ہے اور انہوں نے بہت زور سے اسکی تردید کی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ قلم کیساتھ لکھنے سے خیالات دل اور کاغذ پر جم جاتے ہیں مگر مجھے شک ہے کہ جو محنت اس کے لیے درکار ہے۔ اس کے فوائد اس تضیع اوقات کے مقابلہ میں جو اس سے لازم آتی ہے کچھ بھی نہیں۔ مجھے ڈاکٹر جانسن صاحب سے کلی اتفاق ہے کہ جسکو دو دفعہ پڑھا جاوے۔

پودے پہلے پیدا ہوئے یا جانور؟

ہمارے کرمفرما سید علی حیدر صاحب زیدی عاصی سہارنپوری یہ مضمون سید محمد محسن صاحب زیدی سہارنپوری بی۔اے (علیگ) کی مترجمہ غیر مطبوعہ کتاب "پودوں کی زندگی" سے لے کر ناظرین مخزن کی دلچسپی کے لیئے روانہ فرماتے ہیں جو نہایت خوشی اور شکریہ سے درج کیا جاتا ہے:-

یہ سوال قریب قریب ایسا ہی لغو اور بے معنی ہے جیسا یہ سوال کہ آیا درندے پہلے پیدا ہوئے یا وہ جانور جن کا وہ شکار کرتے ہیں؟ یہ بات ظاہر ہے کہ سب سے پہلے پیدا ہونے والے جانور شیر یا چیتے نہیں ہو سکتے کیونکہ شیر چیتوں اور دوسرے درندوں کا وجود اس وقت تک اس دنیا میں ممکن نہ تھا جس وقت تک ہرن اور بارہ سنگھ وغیرہ ان کے شکار کرنے اور کھانے کے لیے پیدا نہ ہو گئے ہوں۔ اس لحاظ سے جانوروں اور پودوں کا عام تعلق ایسا ہی ہے جیسا کہ درندوں اور اُن جانوروں میں جن کو وہ کھاتے ہیں۔ کیونکہ سب جانور بواسطہ یا بلاواسطہ اپنی خوراک پودوں یا اُن کی پیدا کردہ اشیا سے حاصل کرتے ہیں۔ گوشت خوار جانور بھیڑ، ہرن اور خرگوش وغیرہ کھاتے ہیں لیکن بھیڑ، ہرن، خرگوش وغیرہ گھاس اور دوسری قسم کی جھاڑیاں کھاتے ہیں۔ بالآخر نتیجہ یہی نکلے گا کہ پودے اپنی مدد آپ کرتے ہیں (یعنے اپنی زندگی میں دوسروں کے محتاج نہیں) اور جانور اُن چیزوں کو کھاتے ہیں جو پودے اپنے ذاتی استعمال کے لیے جمع کرتے ہیں۔ ہر جانور اپنی تمام خوراک (سوائے پانی کے) بواسطہ یا بلاواسطہ

پودوں سے حاصل کرتا ہے۔ یا یوں کہنا چاہیئے کہ پودے ہی صرف ایسی چیز ہیں جو جانتے ہیں کہ ذی روح مادہ کس طرح بنایا جاتا ہے۔ پودے جن چیزوں کے پیدا کرنے والے ہیں جانوران کے کھانیوالے ہیں۔

پودے مانند صنوبر کے ہیں جو لکڑی پیدا کرتا ہے اور جانور مانند آگ کے ہیں جو اُس لکڑی کو جلا دیتی اور اُس کو پھر اسکی پہلی غیر مرتبہ حالت میں پہنچا دیتی ہے ؁

پودوں اور جانوروں کے حقیقی باہمی تعلق کو دماغ پر کچھ زور دیے بغیر سمجھنا کسیقدر مشکل ہے لیکن یہ بات اسقدر ضروری ہے اور ہماری آیندہ تحقیقات میں اسقدر کارآمد ثابت ہونے والی ہے کہ میں ناظرین سے یہ درخواست کرنے کی جرأت کروں گا کہ وہ شروع ہی میں اپنے دماغ پر زور ڈال کر اس کو سمجھ لیں +

اگر آپ کوئلے یا لکڑی کا ایک ٹکڑا لیں تو اُس میں ہائڈروجن اور کاربن کی ایک مقدار موجود ہو گی جس میں آکسیجن قریب قریب بالکل شامل ہو گی یا کم از کم اُس مقدار سے بہت کم ہو گی جتنا کہ وہ شامل کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ اب اِس کوئلے یا لکڑی کے ٹکڑے کو جلائیے اور دیکھئے کہ کیا ہوتا ہے۔ وہ جلنے لگتے ہیں یہاں تک کہ جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ اِس جلنے کے کیا معنی ہیں؟ یہی کہ کاربن اور ہائڈروجن تیزی سے آکسیجن میں شامل ہو رہی ہیں۔ آکسیجن کی اُتنی مقدار اُن میں شامل ہوتی جاتی ہے جسقدر شامل کرنے کی اُن میں قابلیت ہے اور اِس آکسیجن سے مل کردہ کاربونک ایسڈ گیس اور پانی کی شکل میں تبدیل ہو رہی ہیں۔

کاربن آکسیجن سے مل کر کاربونک ایسڈ گیس بن جاتی ہے اور کرہ باد میں

میں شامل ہو جاتی ہے اسیطرح ہائڈروجن بھی آکسیجن سے مل کر ابخرات اور بھاپ کی شکل اختیار کرکے ہوا میں شامل ہو جاتی ہے درحقیقت لکڑی یا کوئلہ کا جلنا صرف اُس کے ہائڈروجن اور کاربن کا گرد ہوا کے آکسیجن میں شامل ہو جانا ہے۔ لیکن یہہ بات قابل غور ہے کہ جس وقت کاربن اور ہائڈروجن آکسیجن میں تو اِن سے حرارت اور روشنی پیدا ہوتی ہے۔ یہہ حرارت اور روشنی اُن میں اتصال آکسیجن سے پیشتر بھی موجود تھی یا یوں کہنا چاہیئے کہ یہہ اُن میں غیر متحرک اور پنہاں تھی۔ خالص کاربن اور خالص ہائڈروجن میں انرجی ہوتی ہے یعنے اِن میں روشنی پنہاں اور حرارت غیر متحرک موجود ہوتی ہے جس کو وہ اُسوقت ظاہر کرتی ہیں جبکہ وہ آکسیجن میں شامل ہوتی ہیں۔

اگرچہ لکڑی اور کوئلے میں ہائڈروجن اور کاربن بالکل خالص نہیں ہوتیں تاہم اپنے موجودہ مقاصد کی غرض سے ہم بالکل خالص فرض کر لیتے ہیں +

اب سوال یہہ پیدا ہوتا ہے کہ یہہ روشنی اور حرارت کہاں سے آئی؟ ہم جانتے ہیں کہ لکڑی اُس درخت کا ایک حصہ ہے جس نے کھلی ہوئی اور خالص ہوا میں سورج کی روشنی کی مدد سے پرورش پائی ہے اسیطرح کوئلہ بھی بعض بہت پرانے اور اُن درختوں کا حصہ ہے جو عرصہ دراز تک زمین کے نیچے دبے رہنے کی وجہہ سے سخت ہو گئے ہیں لیکن اُنہیں درختوں کی یہہ خاصیت اب تک موجود ہے کہ وہ جل سکتے ہیں۔ دونوں حالتوں میں جیسا کہ ہم آئندہ زیادہ واضح طور سے دکھلائیں گے یہہ روشنی اور حرارت سورج سے جو مخزن انرجی ہے حاصل کی گئی ہے۔ سورج کی روشنی زمانۂ حال کے درختوں کے پتوں پر اور زمانۂ قدیم کے اُن درختوں پر

جن سے کوئلہ بنا ہے پڑی - اور اُن میں کاربن کو کاربونک ایسڈ گیس کی آکسیجن سے اور ہائڈروجن کو پانی کی آکسیجن سے جدا کر دیا ہے دونو حالتوں میں آکسیجن اپنی خالص صورت میں ہوا میں شامل ہو گئی اور کاربن اور ہائڈروجن (آکسیجن اور دوسری گیسوں کی بہت قلیل مقدار کے ساتھ) قریب قریب خالص حالت میں پتوں میں باقی رہ گئیں لیکن جس بات کیطرف میں خالص طور سے آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آکسیجن کو کاربن اور ہائڈروجن سے عارضی طور پر علیحدہ کرنے کی باعث سورج کی روشنی تھی جس وقت تک کہ پورا جلایا نہیں گیا اسوقت تک وہ روشنی اور حرارت جو اس نے سورج سے حاصل کی ہے اس میں پنہاں اور ساکت رہی اصلی حقیقی روشنی اور حرارت کی صورت میں نہیں بلکہ آکسیجن کی کاربن اور ہائڈروجن سے علیحدگی کی شکل میں - اسی لئے کوئلے کو انگریزی میں بوٹلڈ سنشائن یعنے بوتل میں بھری ہوئی سورج کی روشنی کہا گیا ہے - علاوہ بریں پودے کی پرورش کے لیئے اسیقدر سورج کی حرارت اور روشنی کی ضرورت ہوئی تھی جتنی کہ آپ بعد میں پودے کے جلانے سے حاصل کر سکتے ہیں -

اب ہم کو اپنی لکڑی یا کوئلے کے ٹکڑے کو جلانا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ کیا بات پیدا ہوتی ہے - آکسیجن کے ذرے تیزی سے اس کاربن کے ذروں میں مل رہے ہیں جو لکڑی میں موجود ہے - اور کاربونک ایسڈ گیس بنا رہے ہیں اور اتنی ہی کاربونک ایسڈ گیس بنا رہے ہیں جتنی کہ پودے کے اس حصہ کے بننے میں کام آئی تھی اسی طریقے سے آکسیجن کے دوسرے ذرے لکڑی کی ہائڈروجن میں شامل ہو رہے ہیں اور بھاپ کی شکل میں پانی بنا رہے ہیں - اُسی نسبت سے جتنا کہ پودے کے

اُس حصہ کے بننے میں صرف ہوا تھا جس وقت کہ یہ ذرے ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو وہ اپنی پنہاں (خفتہ) روشنی اور حرارت کو اُس مقدار میں ظاہر کرتے ہیں جتنی کہ انہوں نے پودے کے اُس حصہ کو بناتے میں سورج کی روشنی سے جو اُن پر گر رہی تھی حاصل کی تھی۔

دوسرے الفاظ میں آکسیجن کی وہی مقدار جو کاربن اور ہائڈروجن سے علیحدہ ہو گئی تھی جلتے وقت اُن میں پھر شامل ہو جاتی ہے اور حرارت اور روشنی کی وہی تعداد جو کہ اُن کو علیحدہ کرنے میں صرف ہوئی تھی اب اُن کے اتصال کے وقت پھر ظاہر ہوتی ہے۔

اب ہم اسباب کو اعداد کی امداد سے بتلاتے ہیں تاکہ ہمارا مطلب بالکل صاف ہو جائے۔ ہم اپنا حساب کاربونک ایسڈ کے ایک ریزے اور پانی کے ایک قطرے سے جو سبز پتے کے اندرونی حصے میں ہوتے ہیں شروع کرتے ہیں۔ یہ کاربونک ایسڈ پتے نے ہوا سے حاصل کیا تھا۔ اور پانی کا قطرہ اُس تک عرق کی صورت میں جڑوں کے ذریعے سے پہنچا تھا اب سورج کی روشنی کے اثر سے وہ عناصر (جن سے کہ کاربونک ایسڈ اور پانی بنا ہے) جدا ہو گئے۔

کاربونک ایسڈ کے ایک ریزے میں ایک ذرہ کاربن کا اور دو ذرّے آکسیجن کے ملحق ہوتے ہیں۔ اِس الحاق کے توڑنے اور اِن ذرّوں کو علیحدہ کرنے کے لیے کس قدر سورج کی روشنی کی ضرورت ہوتی تھی جس کو ہم (الف) فرض کر لیتے ہیں۔ اِس روشنی کے اثر سے آکسیجن کاربن سے علیحدہ ہو کر ہوا میں شامل ہو گئی۔ اور کاربن پتہ میں رہ گئی۔ اور پودے کی پرورش کے لئے کام آئی۔ پانی کے ایک قطرہ میں دو ذرے ہائڈروجن

اور ایک آکسیجن کا شامل ہوتا ہے۔ ان ذرّوں کے علیحدہ کرنے [illegible]
سورج کی روشنی مددگار ہوئی تھی اس کی مقدار ہم (ب) [illegible] روشنی کے اثر سے بھی آکسیجن ہائیڈروجن سے علیحدہ ہو کر ہوا میں [illegible]
اور ہائیڈروجن اس کاربن کے ساتھ جو پتے میں رہ گئی تھی مل گئی [illegible]
کاربن اور ہائیڈروجن کے ملنے سے پیدا ہوئی ہے (یعنی لکڑی [illegible]
کیا واقع ہوتا ہے۔ آکسیجن کے دو ذرّے دوبارہ کاربن کے ایک [illegible]
مل جاتے ہیں۔ اور اُن سے کاربونک ایسڈ گیس بن جاتی ہے اور آکسیجن
کا ایک ذرّہ دوبارہ ہائیڈروجن کے دو ذرّوں سے مل کر پانی کا ایک قطرہ
بناتا ہے اور اس الحاق یعنے آکسیجن کاربن اور ہائیڈروجن کے مل جانے
سے ایک مقدارِ حرارت اور روشنی کی پیدا ہوتی ہے جس کی مقدار ٹھیک
الف اور ب کے برابر ہوتی ہے جس کی ضرورت اِن کے علیحدہ کرنے میں
ہوتی تھی۔

میرا خیال ہے کہ اب میں نے واضح طور سے بتلا دیا ہے کہ درحقیقت پودے
کیا ہیں۔ قدرتی حالتوں میں وہ عناصر پودے کا جزوِ اعظم ہیں (یعنی کاربن
اور ہائیڈروجن) صرف آکسیجن سے ملے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ پودا ایک
مشین ہے جو ان عناصر کو سورج کی روشنی کی مدد سے آکسیجن سے جدا کر کے
نئی صورتوں میں تبدیل کرتا ہے جنکی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اِنرجی رکھتی ہیں
جانور اس کی ضد ہے جسطرح کہ پودا پیدا کرنے والا ہے اسیطرح جانور
برباد کرنے والا۔ پودا پیدا کرتا ہے اور جانور اس مادہ کو تلف اور ضائع
کرتا ہے۔ پودا جاندار مادہ بناتا ہے جانور اس کو برباد کرتا ہے۔
درحقیقت جانور تھوڑی تھوڑی سلگنے والی آگ کے مانند ہیں جسمیں پودے کی

اُس حصہ کے بننے میں صرف ہوا تھا جس وقت کہ یہ ذرے ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو وہ اپنی پنہاں (خفتہ) روشنی اور حرارت کو اُس مقدار میں ظاہر کرتے ہیں جتنی کہ انہوں نے پودے کے اس حصہ کو بناتے میں سورج کی روشنی سے جو اُن پر گر رہی تھی حاصل کی تھی۔

دوسرے الفاظ میں آکسیجن کی وہی مقدار جو کاربن اور ہائڈروجن سے علیحدہ ہوگئی تھی جلتے وقت اُن میں پھر شامل ہو جاتی ہے اور حرارت اور روشنی کی وہی تعداد جو کہ اُن کو علیحدہ کرنے میں صرف ہوئی تھی آب اُن کے اتصال کے وقت پھر ظاہر ہوتی ہے۔

اب ہم اسباب کو اعداد کی امداد سے بتلاتے ہیں تاکہ ہمارا مطلب بالکل صاف ہو جائے۔ ہم اپنا حساب کاربونک ایسڈ کے ایک ریزے اور پانی کے ایک قطرے سے جو سبز پتے کے اندرونی حصے میں ہوتے ہیں شروع کرتے ہیں۔ یہ کاربونک ایسڈ پتے نے ہوا سے حاصل کیا تھا۔ اور پانی کا قطرہ اُس تک عرق کی صورت میں جڑوں کے ذریعے سے پہنچا تھا اب سورج کی روشنی کے اثر سے وہ عناصر (جن سے کہ کاربونک ایسڈ اور پانی بنا ہے) جدا ہو گئے۔

کاربونک ایسڈ کے ایک ریزے میں ایک ذرّہ کاربن کا اور دو ذرّے آکسیجن کے ملحق ہوتے ہیں۔ اِس الحاق کے توڑنے اور ان ذرّوں کو علیحدہ کرنے کے لیے کسیقدر سورج کی روشنی کی ضرورت ہوتی تھی جس کو ہم (الف) فرض کر لیتے ہیں۔ اِس روشنی کے اثر سے آکسیجن کاربن سے علیحدہ ہو کر ہوا میں شامل ہو گئی۔ اور کاربن پتہ میں رہ گئی۔ اور پودے کی پرورش کے لئے کام آئی۔ پانی کے ایک قطرہ میں ذو ذرے ہائڈروجن کے

اور ایک آکسیجن کا شامل ہوتا ہے۔ اِن ذرّوں کے علیحدہ کرنے کے لیے بھی
سورج کی روشنی درکار ہوئی تھی اِس کی مقدار ہم (ب) فرض کرتے ہیں۔ اِس
روشنی کے اثر سے بھی آکسیجن ہائڈروجن سے علیحدہ ہو کر ہوا میں شامل ہو گئی
اور ہائڈروجن اس کاربن کے ساتھ جو پتے میں رہ گئی تھی مل گئی اب جو چیز
کاربن اور ہائڈروجن کے ملنے سے پیدا ہوئی ہے (یعنی لکڑی) جلائیے اور دیکھیے کہ
کیا واقع ہوتا ہے۔ آکسیجن کے دو ذرے دوبارہ کاربن کے ایک ذرے سے
مل جاتے ہیں۔ اور اُن سے کاربونک ایسڈ گیس بن جاتی ہے اور آکسیجن
کا ایک ذرہ دوبارہ ہائڈروجن کے دو ذروں سے مل کر پانی کا ایک قطرہ
بناتا ہے اور اِس لحاق یعنے آکسیجن کاربن اور ہائڈروجن کے مل جانے
سے ایک مقدار حرارت اور روشنی کی پیدا ہوتی ہے جس کی مقدار ٹھیک
الف اور ب کے برابر ہوتی ہے جس کی ضرورت اِن کے علیحدہ کرنے میں
ہوتی تھی۔

میرا خیال ہے کہ اب میں نے واضح طور سے بتلا دیا ہے کہ در اصل پودے
کیا ہیں۔ قدرتی حالتوں میں وہ عناصر پودے کا جزو اعظم ہیں (یعنی کاربن
اور ہائڈروجن) صرف آکسیجن سے ملے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ پودا ایک
مشین ہے جو ان عناصر کو سورج کی روشنی کی مدد سے آکسیجن سے جدا کر کے
نئی صورتوں میں تبدیل کرتا ہے جن کی خصوصیت یہہ ہے کہ وہ انرجی رکھتی ہیں
جانور اِس کی ضد ہے جس طرح کہ پودا پیدا کرنے والا ہے اسی طرح جانور
برباد کرنے والا۔ پودا پیدا کرتا ہے اور جانور اِس مادہ کو تلف اور ضائع
کرتا ہے۔ پودا جاندار مادہ بناتا ہے جانور اِس کو برباد کرتا ہے۔
درحقیقت جانور تھوڑی تھوڑی سلگنے والی آگ کے مانند ہیں جس میں پودے کی

پیدا کردہ اشیار مانند گھاس پھل غلہ وغیرہ اشیا آہستہ آہستہ جلتی رہتی ہیں
دوبارہ اپنی پہلی حالت میں واپس پہنچتی رہتی ہیں۔

جانور وہ اشیا کھاتا ہے جو پودے پیدا کرتے ہیں اور جب وہ سانس لیتا ہے یا یوں کہنا چاہیئے اس کے پھیپھڑوں میں آکسیجن پہنچتی ہے تو آکسیجن پھر کاربن اور ہائڈروجن سے مل جاتی ہے۔ اور مل کر پھر کاربونک ایسڈ گیس اور پانی بناتی ہے اور وہ حرارت جو اس خوراک میں (جو جانور نے پودے سے حاصل کی تھی۔) پوشیدہ اور ساکت تھی۔ اب جانور کے جسم میں حرارتِ حیوانی اور حرکتِ حیوانی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ +

دلائل بالا سے صاف ہوگیا ہے کہ جانور پودوں کی بالکل ضد ہیں جو کچھ پودے بناتے ہیں جانور اسکو پھر ضائع کردیتے ہیں +

خلاصہ یہہ کہ پودے آکسیجن کو کاربن اور ہائڈروجن سے علیحدہ کرنے اور سورج کی (انرجی) کو جمع کرنے کی مشین ہیں۔ جانور آکسیجن کو کاربن اور ہائڈروجن سے ملانے اور جمع شدہ سورج کی حرارت کو حرکت اور حرارت کی صورت میں استعمال کرنے کی مشین ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ یہہ سوال "آیا جانور پہلے پیدا ہوئے یا پودے؟ کیوں بے معنی اور فضول ہے۔ یہہ سوال بالکل ایسا ہے جیسا کہ یہہ کوئلے پہلے پیدا ہوئے یا آگ"؟۔ دنیا کا سب جان دار مادہ پہلے پودوں نے بنایا۔ اور جمع کیا تھا۔ صرف پودے ہی مردہ اور بے جان پانی اور کاربونک ایسڈ سے جان دار اور حرارت رہنے والا مادہ بنانے کی قوت رکھتے ہیں۔ وہی زندگی کی اصلیت اور سبب ہیں۔ ان کے بغیر دنیا میں کوئی زندہ مخلوق نہیں ہوسکتی

صرف انہی کے سبز و تر و تازہ حصوں میں مردہ مادّے کا زندہ حالتوں میں تغیّر ظہور میں آتا ہے۔ صرف وہی اس راز سے واقف ہیں کہ سورج کی اُس روشنی کو جو اُن پر پڑتی ہے کس طرح جمع کریں اور کام میں لائیں۔ جو کام جانور کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ جان دار مادہ کو جو کہ پودے نے اُس کے لئے بنایا ہے کھائے اور اُس کو آہستہ آہستہ اپنے جسم میں تلف و برباد کر دے وہ اُس مادہ کو اسی طرح برباد کرتا ہے جیسے کہ آگ۔ اور اسکو پانی اور کاربونک ایسڈ کی مردہ اور بے جان شکلوں میں تبدیل کر کے ہوا میں شامل کر دیتا ہے۔

اس سے یہ امر صاف ظاہر ہے کہ پودے جانوروں سے پہلے پیدا ہوئے ہیں اور سب سے پہلی زندہ مخلوق صرف وہ پودے ہوں گے جو نہایت سادہ قسم کے ہوں گے لیکن جن میں پودوں کے یہ خواص کہ وہ سبز ہوں اور سورج کی روشنی کی مدد سے کاربن اور ہائڈروجن کو آکسیجن سے علیحدہ کریں موجود ہوں گے۔ یہی حقیقی پودوں کی سب سے پہلی خاصیت ہے۔ اگرچہ اب بعض پودوں نے اپنی آبائی عادتوں کو چھوڑ دیا ہے اور جانوروں کی خصلتیں اختیار کی ہیں۔[1]

اب یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ سب سے پہلا پودا کس طرح پیدا ہوا۔؟

اس بارہ میں فی الحال ہم بہت کم جانتے ہیں ہم صرف یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ بہت پرانے زمانے میں جبکہ مادہ بہ نسبت زمانہ حال کے زیادہ تازہ ہو گا اور اس میں دوسری صورت اختیار کرنے کی زیادہ قابلیت ہو گی اسوقت چند ذرّے سورج کی روشنی کے اثر سے مل گئے اور اس طرح سب سے پہلا

[1] یہاں فاضل مصنف کی مراد اُن درختوں سے ہے جو رفتہ رفتہ ترقی کر کے نباتات و حیوانات کے بیان جد پر پہنچ گئے ہیں و شکار کرتے ہیں بس قسم کے درخت [illegible] (مترجم)

نامی جسم بنا اور یہی طبعی خلقت ہوگی۔

اسباب کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا کہ آیا کبھی اس قسم کی طبعی خلقت ظہور میں آئی یا نہیں"؟ اگرچہ بعض آدمی جو رائے دینے کے قابل ہیں خیال کرتے ہیں کہ بہت پرانے زمانے میں اور خاص حالتوں میں غالباً ایسا واقع ہوا ہوگا۔ لیکن یہہ بات یقینی ہے کہ کم از کم زمانہ حال میں کوئی اس قسم کی طبعی خلقت ظہور میں نہیں آتی بشاید اسکی وجہ یہہ ہو کہ سب کارآمد مادہ کسی نہ کسی کام میں لگا ہوا ہے یا یہہ کہ اس زمانے کی حالت اس کے موافق نہیں ہے۔ کوئی بھی وجہ کیوں نہو ہمارے پاس یہہ یقین کرنے کے بہت اسباب موجود ہیں کہ فی زمانہ ہر ایک زندہ چیز خواہ وہ پودا ہو یا جانور ایک پہلی زندہ مخلوق سے پیدا ہوئی ہے۔ یا دو زندہ چیزوں سے پیدا ہوئی ہے جو اس کے باپ اور ماں ہیں +

ایسا کیوں ہے؟ اگر آپ ایک لمحہ کے لئے غور کریں گے تو آپکی سمجھ میں آجائے گا کہ یہہ نتیجہ قدرتاً اُن باتوں سے اخذ ہو سکتا ہے جن کو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ پودہ پانی اور کاربونک ایسڈ سے سورج کی روشنی کی مدد سے جان دار مادہ بنانے کی مشین ہے۔ جس وقت تک سورج کی روشنی سبز پودے پر پڑتی رہتی ہے پودا برابر کاربونک ایسڈ ہوا سے بذریعہ اپنے پتوں کے اور پانی زمین سے بذریعہ اپنی جڑوں کے حاصل کرتا رہتا ہے۔ اور اُن سے جان دار مادہ بناتا رہتا ہے۔ اس طریقے سے اُس کو ہمیشہ بڑھنا چاہیئے یا یوں کہنا چاہیئے کہ جان دار مادہ کی مقدار ہمیشہ زیادہ ہوتی جانی چاہیئے +

اس سے نتیجہ یہہ نکلتا ہے کہ کچھہ عرصے میں وہ بہت زیادہ بڑا ہو جائے گا

اور سادہ پودے اس حالت میں جبکہ وہ بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ یہی اصلیت دوبارہ[۱] پیدا کرنے کی ہے۔ سادہ شکلوں میں دوبارہ پیدا کرنے کے یہ معنی ہیں کہ جب ایک جسم اتنا بڑا ہو جاتا ہے کہ وہ آسانی سے اپنے آپ کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ تب وہ دو حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ اور ہر حصہ اس طرح سے بڑھتا رہتا ہے جیسے کہ بڑا پودہ بڑھتا تھا۔

یہ بات آپ کو عجیب اور انوکھی معلوم ہو گی۔ کیونکہ آپ اسوقت بڑے اور ترقی یافتہ پودوں کا مثل آلو مٹر وغیرہ کے خیال کر رہے ہیں۔ مگر آپ کو یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ ہم اس وقت زمانۂ قدیم کے بہت سادہ ابتدائی پودوں کے بارے میں لکھ رہے ہیں اور یہ پودے نہایت چھوٹے چھوٹے سبز ذرے ہوتے ہیں جو پانی پر تیرتے رہتے ہیں۔ عموماً بغیر دوربین کے دکھلائی نہیں دیتے اور حقیقت میں وہ سبز لعاب کے بہت چھوٹے چھوٹے ذرے ہوتے ہیں۔ تاہم ان چھوٹے چھوٹے خفیف ذرّوں سے یہ شاندار جنگلی درخت بہت بے تعداد نسلوں کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ان بڑے اور ترقی یافتہ پودوں کے خواص سمجھیں تو ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے ان چھوٹے اور سادہ پودوں سے شروع کریں*

زمانہ قدیم کے سب سے پہلے پودے پانی پر بہتے رہتے تھے۔ اس بات کے ماننے کی بہت وجوہ ہیں کہ ابتدا میں بہت عرصہ تک دنیا میں خشک زمین

[۱] فاضل مصنف کی سادہ یا ابتدائی پودے سے وہ حالت مراد ہے جبکہ نامی چیزوں کا سب سے پہلی دنیا میں نشوونما ہوا یہ پودے نہایت چھوٹے چھوٹے ہوتے تھے اور ایک حد معین پر پہنچ کر ان کے دو حصے الگ ہو جاتے تھے کہ جدا جدا اپنی غذا ہوا وغیرہ سے حاصل کریں اور ایک کا دوسرے سے تعلق نہ رہے اس کو فاضل مصنف نے "دوبارہ پیدا کرنا" کہا ہے۔ (مترجم)

بالکل نہ تھی کرہ ارض کی تمام سطح ایک بحر ناپیدا کنار سے ڈھکی ہوئی تھی۔ بہرحال سب سے زیادہ سادہ اور سب سے پہلی زندہ مخلوق جو اب تک باقی ہے پانی میں پائی جاتی ہے۔ جبکہ قریب قریب تمام ترقی یافتہ اعلیٰ اقسام کے پودے۔ اور جانور خشکی کے رہنے والے ہیں۔ اس وجہ سے یہ نتیجہ نکالنا خلافِ عقل نہ ہوگا کہ زندہ مخلوق پہلے پانی میں پیدا ہوئی اور پھر رفتہ رفتہ خشکی میں پھیلی۔

تیرنے والے لعاب کے مانند درخت آسانی سے اتنی جسامت پر پہنچ جاتے ہونگے جبکہ ان کے لیئے دو ٹکڑوں یا حصوں میں تقسیم ہو جانا آسان ہو یا یہ کہنا چاہیئے کہ ان کے لیئے ایک جسم کو قائم رکھنا مشکل ہو جائے اس زمانے میں بھی اکثر بہت چھوٹے پانی پر تیرنے والے پودے موجود ہیں۔ جو کسی وقت تک بڑھتے رہتے ہیں۔ جب تک وہ ایک حدِ مقررہ پر نہ پہنچ جائیں۔ اس حد پر پہنچکر وہ دو مماثل اور برابر حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ دوبارہ پیدا کرنے کی یہ سب سے زیادہ سہل شکل ہے جو کہ ہم اب تک معلوم کر سکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ دونوں حصے جن میں پودا تقسیم ہو جاتا ہے بالکل ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں۔ اور یہی بنیاد ہے اس مسئلہ کی کہ خواص جسمانی اور روحانی نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ یعنی یہ کہ باپ اور بیٹے میں عام مشابہت ہوتی ہے۔ اس مشابہت کی وجہ یہ ہے کہ اصل میں وہ ایک تھے۔ جبکہ ایک پودا دو حصوں میں منقسم ہوتا ہے تو ان میں سے ایک حصہ میں خواص موجود ہوتے ہیں جو پہلے اصلی پودے میں تھے۔

آپ نے اشتباہ پر خیال کیا ہوگا کہ ہم نے یہاں باپ اور بیٹے کے الفاظ استعمال کیئے ہیں۔ ہم نے ایسا کچھ تو رواج کی وجہ سے کیا ہے اور کچھ یہ ظاہر کرنے کے لیئے کہ یہ بحث اور دلائل ہم کو کہاں لے جاتی ہیں۔

لیکن حقیقت ایسے سادہ پودوں میں تقسیم شدہ حصوں میں سے کوئی ماں یا بیٹیا ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ بالکل برابر اور یکساں ہوتے ہیں۔ تاہم زیادہ اونچے درجے کے پودوں میں ہم معلوم کرتے ہیں کہ درخت کا خاص حصہ بڑھتا رہتا ہے۔ اور اپنی نسل کے قایم رکھنے کے لیے زیادہ چھوٹے حصے جن کو بیج یا گٹھلی کہتے ہیں پیدا کرتا رہتا ہے یہاں ہم صفائی کے ساتھ بڑے درخت کو باپ اور چھوٹے چھوٹے درختوں کو جنہیں کہ وہ اپنے سے پیدا کرتا ہے اسکے بچے یا اولاد کہتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ ان ذو حدود کے درمیان قدرت میں بیشمار قسمیں اور ہیں مختلف قسمیں غیر معلوم طریقے سے ایک دوسرے میں شامل ہوگئی ہیں۔ کوئی بھی حدِ آخر ایسی نہیں ہے جہاں ہم یہ کہہ سکیں کہ دو حصوں میں تقسیم ہوکر دوبارہ پیدایش کا فعل بند ہوکر انڈوں اور بیجوں کے ذریعے شروع ہوا ہے۔

علاوہ بریں سادہ ترین اور سب سے ابتدائی پودے صرف ایک جنس رکھتے ہیں وہ بڑھتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ دو حصوں میں تقسیم ہوجاتے ہیں بعدہ یہ دونو نصف حصے علیحدہ علیحدہ بڑھنے شروع ہوجاتے ہیں۔ دو مختلف پودے یا پودے کے دو مختلف حصے اس نئے پودے کے بنانے میں حصہ نہیں لیتے لیکن اعلیٰ درجے کے پودے مثل اعلیٰ درجے کے جانوروں کے نر و مادہ ہوتے ہیں اور ان حالتوں میں دو مختلف پودے مل کر ایک نیا پودا پیدا کرتے ہیں۔ یہ اس نئے پودے کے ماں باپ ہوتے ہیں اور یہ نیا پودا انکا بچہ ہوتا ہے۔ زیرے کا ایک چھوٹا سا دانہ سبکو نر درخت پیدا کرتا ہے مادہ درخت کے پیدا کردہ بیجوں سے ملتا ہے اور ان دونوں کے ملنے سے ایک نیا پودا ہوتا ہے جو اپنی خاصیتیں دونوں سے برابر حاصل کرتا ہے +

حُرّیت و مُساوات

ہمارے عنایت فرما مولوی جواد علی خان صاحب عباس علی محمد پوری کا ایک پر مغز اور محققانہ مضمون مشرق و مغرب گذشتہ نمبر میں ناظرین مخزن کے مطالعہ سے گذر چکا ہے جسکا ایک ایک حرف مولوی صاحب کی تحقیق محنت اور وسیع معلومات کا پتہ دے رہا تھا۔ ہم مولوی صاحب کے ممنون ہیں کہ باوجود کثرت اشغال اور عدیم الفرصتی کے یہ دوسرا مضمون جسکی تلاش قابل داد ہے مخزن کو عطا فرماتے ہیں +

آفریں! و صد آفریں اُس انسان کی تہذیب و انسانیت پر کہ ہمدردی بنی نوع جسکا اخلاق عام نہیں سرشت، اور شیوہ، دیرینہ ہے، ایسا ہمدرد و فراخ حوصلہ انسان! کہ مال سا انمول جواہر جسکی چمک نے ایک عالم میں اُجالا پھیلا رکھا ہے، ہمدردی کے اونٰے اونٰے مواقع پر دے ڈالنے کو بدل وجان راضی، ایسا شفیق کہ عیش و عشرت کی نوبہار کلیاں کسی بے نام ونشان کشتۂ غم کے مزار حسرت بار پر چڑھانے کو طیار، ایسا جاں نثار کہ جان شیریں سی پیاری اور عزیز شے جو جا کے پھر کبھی لوٹ آتی ہی نہیں ابنائے جنس کی معاونت اور جماعت کی رفاہ و سعادت کی راہ میں نثار کرنے پر نہایت مردانگی سے کمربستہ

الغرض انسان! نہ صرف انسان! درد و محبت کا پُتلہ، جان نثاری و وفا شعاری کا فرشتہ، اُس کا جو قدم پڑتا ہے، دلسوزی کی راہ میں، اور زبان سے جو کلمہ نکلتا ہے رفاقت و راحت اغیار کی شان میں،

تن، مَن، دھن، سب بالائے طاق رکھئے حکمت و دانائی جو دُنیا کی

سب نعمتوں میں ایک احد اور عدیم المثال نعمت ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اس کی بھی تمام کارگذاریاں اور دوڑ دھوپ اپنے ابنائے جنس ہی کے روشنی دماغ، اسباب آسایش مہیا کرنے، ان کو اور دیگر مدارج زندگی کو آسان اور خوشگوار بنانے کے لیے ہیں۔ دنیوی اصلاح کی ضرورت محسوس ہوئی، تو اس کی خاطر مادی تحقیقات کی، کرہ ارض میں چھپے ہوئے مواد طبعی کو مشکل ترکیبوں سے نکالا، اور پھر اس مواد طبعی کے عجیب و غریب استعمالات سے کائنات کو ان کے لیئے مسخر کیا، صحن دنیا جو ابتک عمان وحشت، اور دشت پرخار تھا، ہنرمندی، اور سلیقہ شعاری سے اس کی چمن بندی کر کے وہ وہ گل کھلائے کہ بہشت بریں کو بھی اسپر رشک آیا۔ معاش سے چھوٹے تو معاد پر آئے، ذخیرہ آخرت جمع کرنے کی طرف توجہ دلائی تو اسی آپ ہی نے خدائی احکام گوش شنوا تک پہونچائے۔ روحانی تعلیم و صفائی باطن سے دل سرور اور خانہ قلب معمور کیا۔

انبیا علیہم السلام نے اس اتنی سی بات کے لیے کیا کیا زحمتیں نہ گوارا فرمائیں کہ ظالم اور وحشی انسان فضائل کا اکتساب کرے، اور رذائل سے اجتناب، باہمی الفت و اتحاد سے فائدہ اٹھائے تاکہ انسانیت کا مصداق صحیح کہلائے، انھیں صاحب ارشاد معلمین اخلاق کا فیضان تعلیم تھا، کہ انسان میں میل ترقی ہوس تعالی، ایثار، خیال مساوات وغیرہ کی ممتاز صفات پیدا ہوئیں ہیولے نے ایسی صورت جسمیہ اختیار کی جس کے اجزاء ترکیبی میں ایثار، رحم و کرم کا عنصر اعظم شریک تھا جس کے بعد خود اس نے فلسفہ اخلاق و معاشرت بنایا، سیاست کے اصول ترتیب دیئے، تمدن جو کارخانہ کائنات کا فن سکھاتا ہے، صحیفہ موجودات کے عمیق مطالعہ کی ترغیب دیتا ہے، اسکی مسندلی،

الغرض انسانی افعال کے سلسلۂ اسباب و علل پر غور کیا جائے تو تقریباً اوس کی تمام ریشہ دوانیوں کی غرض و غایت یہی ٹھہرتی ہے کہ جس طرح افراد انسانی میں کوئی نوعی امتیاز نہیں، واقعات نے جو اُن کے ظاہری حالات (عسر و یسر) میں اختلاف ڈالا ہے، وہ بھی دفع ہو جائے۔ اور رشتۂ اتفاق قائم ہو جائے۔ دوسروں کی تکلیف میں برابر کا حصہ لیا جائے۔ جو متمول ہیں اُن کی دولت و ثروت میں بے نواؤں کو حصہ دیا جائے۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں یورپ کے چند ایثار نفس عالی حوصلہ ارباب، غیرت و حمیت نے اِس تحریک کو خاص اہمیت دی، اور ایسا چمکایا کہ تمدنِ جدید سے عرصہ تک اُسکا نقش مٹنے والا نہیں،

اسمیں شک نہیں کہ قرونِ اولیٰ یا اُس سے پہلے روشن ضمیر ہادیانِ برحق نے اسکے وعظ زور و شور سے کیے تھے۔ اور اب جو کچھ بھی کہا گیا وہ انہیں مواعظ حسنہ کی آواز بازگشت تھی، لیکن اگلوں کا لہجہ نرم اور اس عنوان سے تھا کہ

خوشتر آن باشد کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

اور یہ بجلی کا ایک کڑکا تھا،

قبل اِس کے کہ ہم دورِ جدید پر تاریخی روشنی ڈالیں دورِ قدیم کے حالات کا بھی اندازہ کریں گے۔ یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ مغربی مباحثوں میں اِس بحث کا نام سوشل ازم رکھا گیا ہے۔ اور مشرق میں اجتماعیہ کے لفظ سے اسکی تعبیر ہوئی۔

قدیم تمدن میں تسلیم مساوات	قوانین قدرت نے حقوق و فرائض انسانی میں جو مساوات کا حکم دیا ہے اُس میں

نکتہ یہ ہے کہ کارخانۂ دنیا کے سب کل پُرزے دُرست ہو جائیں ہر فرد بشر اپنی قابلیت کے مطابق اُس کی ڈیوٹی انجام دے۔ اور اُسی حیثیت کا وہ معاوضہ پائے جس کے بعد ایک دوسرے کا شریک کُل بنجائے۔

اجتماعیہ کے واعظین نے اسی قانون کی جبری تعمیل کے لئے سرُدھنا ضعیف اور بے نواؤں کی زبردستوں کے مقابلہ میں پشت پناہ بنتے، جنھوں نے آبائی وجاہت پر تکیہ کرنا چاہا اُن سے یہ آواز بلند یہ کہدیا کہ شانِ تکبر الٰہی محض اُنھیں کے لیے زیبا ہے جو ذاتی فضل و کمال اور ہنر رکھتے ہوں، آبائی استحقاق نے اگر اُنھیں بڑھایا تو اُنھوں نے نظروں سے گرایا، کیونکہ فضائل اخلاق سے معرّا ہو کر نشہ اطمینان تو اُنھیں محض خودداری میں مست رکھیگا جس سے تمام نادار ضعیف اُنکی نگاہ میں حقیر ہو جائیں گے۔ اور اُن پر ظلم ہوگا۔ یہ حریفانہ نسبت قائم ہونے کے بعد امیر سے فقیر کی چارہ سازی کی امید جیسی کچھ ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے

اُولوالعزم شارعین نے بڑے شد و مد سے اپنے متبعین کو بیکسوں کی امداد و اعانت کیطرف قولاً و فعلاً متوجہ کیا ہے۔ مساوات کے خیال کو قوت دی ہے اور اسے اپنی تعلیم کا اہم موضوع قرار دیا ہے۔ اگر حضرت موسےٰ نے بنی اسرائیل کو مصریوں کے مظالم سے چھڑایا، تو حضرت مسیح نے اپنی اُمت کے امراء، حکام، اور ذی اقتدار اصحاب کو ظلم و تعدی کی نا پاک عادت سے دور رہنا سکھایا، یہی نہیں بلکہ اپنی تعلیم میں دُنیاوی ثروت کو عذاب آخرت کی نشانی اور عزت کو نجاۃ آخرۃ کا باعث قرار دیا، جناب رسول اللہ نے ترغیب پر و ہی، ہمدردی اور فقراء و مساکین کے ساتھ سلوک کرنے کو اس طور سے باضابطہ فرض اُمت قرار دیا، کہ مسلمان اغنیا جو

معینہ نصاب کے مالک ہوں، وہ اپنے مملوکہ ذخیرہ کا ایک عشر عشیر زکوٰۃ کے نام سے غریب بھائیوں کی امداد کے لیے سالانہ دیا کریں، اور پھر مستحقین[۱] کے مدارج و ترتیب بلحاظ اُن کی عسرت کے قایم کیے۔

زکوٰۃ کے مسئلہ پر اگر اصولی اجتماع کی روسے نظر ڈالی جائے۔ تو کسقدر مہتم بالشان مسئلہ ٹھہرتا ہے۔ طبقات اُمت میں اجتماعی خیالات کو قوت بخشنے والا کوئی طریقہ زکوٰۃ دینے سے بڑھکر نہیں ہو سکتا۔ صدرِ اسلام کا زمانہ جبکہ زکوٰۃ دینے کے لوگ عادی تھے، موجودہ دور سے اجتماعی حالات میں بدرجہا افضل تھا،

بعد کو عہد خلافت عباسیہ میں جبکہ شخصیت کو غلبہ، اور مساوات و حریت کو شکست ہو رہی تھی، ایک صدا رعوام کی حمایت میں بلند ہوئی تھی جسمیں اقتضار زمانہ کے لحاظ سے ویسی ہی رعائتیں چاہی گئی تھیں جنکا موجودہ تمدن بلحاظ حالت آجکل خواہاں ہے۔ انہیں میں ایک گروہ نے اپنی مقصد براری میں یہانتک غلو کیا تھا، کہ حیز اعتدال سے دور جا رہے، یعنے اُن کا فتوی تھا، کہ متمول لوگوں کے مال کا سرقہ مباح ہے، اِس فتوے کا اثر یہانتک ہوا تھا، کہ تجار کے قافلوں پر فقرا (ڈاکو) آکر مسلط ہو جاتے تھے اور اُنکا مال کھلے خزانے اُٹھا لیجاتے تھے۔ اُن کی دلیل یہ تھی، کہ جب اُن کے حق کی زکوٰۃ اسیر ادا نہیں کی گئی تو اُن کا حق جو اس مال میں تھا، وہ اس سے وابستہ رہا۔ اور زکوٰۃ نہ ادا کرنے سے مال مستہلکہ

---

[۱] مستحقین زکوٰۃ کے مدارج و ترتیب کا ذکر اس آیۂ کریمہ میں نہایت وضاحت سے کیا گیا ہے
إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ

ہو جاتا ہے اسلیئے اصحاب مال کے قبضہ سے مال کا تلف ہو جانا اور اُن کے قبضہ میں آنا ہر دو امور لازمی ٹھہرے۔

خلاصہ یہہ کہ تقریباً ہر زمانہ اور ہر قرن میں خواص (طبقہ امرا) کے مقابلہ میں عوام (صاحب احتیاج) کے حامی اُن کی حمایت میں سرگرم رہے ہیں، اگر یہہ نہوتا تو خوارج قرامطہ اسماعیلیہ کے داعی حباب کی طرح اُٹھکر سرنگوں ہو گئے ہوتے اور آج اُنکا نام بھی جہان میں نہوتا،

مگر وہ گذشتہ ہماری نگاہوں سے اسوجہ سے پنہاں ہیں اور اگلوں کے حالات سے ہم اس مطلب تک بہ آسانی اسوجہ سے نہیں پہونچتے کہ پہلے یہ جوش دین کے نام سے اور مذہبی رنگ میں پیدا کیا جاتا تھا اور آج قوم، وطن، انسانیت، اجتماعیہ کے نام سے ہے،

حریت و مساوات، اور تمدن جدید اوپر کے بیان سے اس مسئلہ پر پوری روشنی پڑ گئی کہ مبادی اجتماعیت یہ ضرور ہیں، گو اسوقت تمدن، اور مصلحت عامہ کے رواج پذیر، اور شہرت یاب نہونے سے اسقدر اسکا جوش و خروش نہ تھا، اب جبکہ علوم کی روشنی زمانہ میں ہر طرف پھیل گئی ہے، شخصی حریت کی روح بھی ہر جسم میں دوڑ گئی۔ تمدنی مسائل کے خوب واضح و روشن ہو جانیسے اسکا تذکرہ ہر زبان پر ہوا۔ اور ہر ہجیں شخص صلاحی جد و جہد میں حصہ لینے لگا،

مختصر یہہ کہ جسقدر یہہ موضوع وسیع اور ذاتی اہمیت رکھتا تھا، ویساہی اس کے ساتھہ شغف کیا گیا۔ دماغی و مذہبی معرکہ میں بھی اسکو نمایاں فتح حاصل ہوئی۔ لٹریچر ہی کرہ و دشت بھی حریت و مساوات کی صداؤں سے گونج اُٹھے۔ فنون جدیدہ نے، ایجاد و اختراع کا راستہ صاف کر دیا

جس پر چل کے ہر شخص بلا امتیاز اپنا رزق و روزی حاصل کرنے لگا۔ مالداروں کی دلبستگیں صنعت و حرفت کے کام آئیں، پیشہ وروں کی گرم بازاری ہوئی جو ام جو نظرِ حقارت سے دیکھے جاتے تھے۔ اُن سے دوستانہ معانقہ کی نوبت آئی۔

اِس انقلابِ عظیم کی صدا ر فرانس کے اُفق سے بلند ہو کر امریکہ کے ساحلوں سے ٹکرائی۔ پھر وہاں سے انگلستان و المانیا وغیرہ میں پہونچی اور دنیا کے ایک بڑے آباد حصہ نے شخص پرستی کے بند سے آزادی حاصل کی،

اِن ممالک کے مفید اور اصلاحی سبق دینے والے تاریخی حالات کی لطافت کا خیال ہمیں مجبور کر رہا ہے کہ نظرِ اختصار چند عنوانات کے ذیل میں ہر مقام کی بیداری کے واقعات، اور اُس وقت کے جناب ایثار مردانِ خدا کے کارنامے درج کریں۔ اور چونکہ اِس بیداری میں فرانس کو تقدم حاصل ہے اسلیئے یہاں بھی اُسکی اوّلیت بجالانے پائے۔ فقط (باقی آئندہ)

خان عالی۔

فلسفہ صرف و نحو۔ مولوی احسن مرزا صاحب شررؔ مشہدی نے اِس کتاب میں عربی صرف و نحو پر نہایت معقول و مدلل بحث کی ہے - بہت سی باتیں جن کے سمجھنے میں طلبا کو سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ نہایت آسان پیرایہ میں بیان کی ہیں یہ کتاب صرف طلباء ہی کے واسطے مفید ہے بلکہ عربی زبان کے شوقین بھی اِسی طرح فائدہ اوٹھا سکتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ مولوی صاحب کی یہ محنت ملک و قوم میں وقعت سے دیکھی جائیگی۔ قیمت ۱۲؍

مصنف سے بخاری ٹولہ مکان منشی مہیتاب ی حسن صاحب حسن سے ملتی ہے

"سید سالار مسعود"

منشی محمد ظفر علی صاحب تحصیلدار مولوی سید عبد السبحان صاحب مولف آفتاب رسالت کی کتاب المجموح سے جو ابھی طبع نہیں ہوئی یہ مضمون مخزن میں بغرض اندراج روانہ فرماتے ہیں۔ ہم منشی صاحب کی اس عنایت کے مشکور ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ناظرین مخزن سید صاحب کے اس مضمون کو دلچسپی سے پڑھیں گے +

جسقدر سالار موصوف کے نام کو بقار دوام کا شرف حاصل ہے اوسیقدر آپکے تفصیلی حالات گمنامی کے پردہ میں چھپے ہوئے ہیں۔ اسم شریف سید مسعود لقب سلطان الشہدا تھا لیکن سید سالار مسعود غازی یا غازی میاں مشہور ہیں۔ ۲۱ رجب سنہ ۴۰۵ھ مطابق سنہ ۱۰۱۵ء بروز یکشنبہ آپکی ولادت ہوئی۔ اور ۱۸ رجب سنہ ۴۲۴ھ مطابق ۱۴ جون سنہ ۱۰۳۳ء بروز یکشنبہ صبح کے وقت آپ شہید ہوئے۔ تاریخ فرشتہ[۱] میں شہادت کا سنہ ہجری ۵۵۵ اور ایلیٹ صاحب نے بحوالہ مصنف تاریخ فرشتہ وصبح صادق سنہ ۴۲۳ھ لکھا ہے۔ بیل صاحب ۲۱ ماہ شعبان ولادت اور ۱۴ رجب روز جمعہ وفات کی تاریخ لکھتے ہیں۔ بہرحال یہ تاریخیں بجائے خود مشتبہ ہیں اور فرشتہ کا بیان اسلیے اور بھی غلط معلوم ہوتا ہے کہ اوسوقت سلاطین غزنویہ میں جن کے سلسلہ خاندان میں آپ شامل ہیں اسقدر قوت باقی نہ رہی تھی

[۱] آپکے حالات تاریخ فرشتہ۔ آئین اکبری۔ عجائب الاسفار۔ بہرایچ کے گزیٹر۔ الیٹ صاحب کی کتاب "ضمیمہ فرہنگ اصطلاح ممالک مغربی وشمالی" اور مفتاح التواریخ مصنفہ مسٹر ٹامس ولیم بیل سے لیئے گئے ہیں۔ ۱۲-

گو وہ ہندوستان میں اتنے دور دراز فاصلہ پر لشکر روانہ کر سکتے۔ مورخین کہتے ہیں کہ سپہ سالار کی والدہ ماجدہ ستر معلی سلطان محمود غزنوی کی بہن تھیں۔ اور آپ کے والد کا نام سالار ساہو تھا سلسلہ نسب[1] آپکا حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک پہونچتا ہے۔ اس طرح سے جیسا کہ سید سالار مسعود بن سالار ساہو۔ بن عطاء اللہ غازی۔ بن طاہر غازی بن طیب غازی۔ بن محمد غازی۔ بن عمر غازی بن ملک آصف غازی۔ بن بطل غازی بن عبد المنان بن محمد حنفیہ۔ بن اسد اللہ الغالب بن ابی طالب رضی اللہ تعالے علیہم اجمعین۔

---

[1] مصباح التواریخ کا مصنف مرآت مسعودی کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ سالار مسعود محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے تھے۔ اور محمد بن حنفیہ بن علی رضی اللہ عنہ کے دو بیٹے تھے (۱) عبد الفتاح (۲) عبد المنان خواجہ احمد لوی بیرزگستان عبد الفتاح کی اور سالار مسعود عبد المنان کی اولاد میں ہیں۔ لیکن ابن قتیبہ نے محمد بن حنفیہ کی اولاد کے یہ نام لکھے ہیں حسن عبد اللہ۔ ابو ہاشم جعفر۔ حمزہ۔ علی۔ جعفر اصغر۔ عون۔ اور مصنف عمدۃ المطالب نے لکھا ہے کہ سوا جعفر بن محمد اور علی بن محمد کے محمد بن حنفیہ کے اور کسی بیٹے کی اولاد موجود نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ سالار مسعود علوی ہوں لیکن محمد بن حنفیہ کے بیٹوں کے وہ نام نہ تھے جو لکھے گئے ہیں۔ ابو الفضل نے سالار موصوف کی نسبت لکھا ہے کہ "از خویشاوند سلطان محمود غزنوی است" فرشتہ کہتا ہے کہ "از اقارب سلطان محمود غزنوی بودہ کہ در عہد اولاد سلطان محمود غزنوی در ۔۔۔ ہجری بدست کفار مقتول گردیدہ" دارا شکوہ نے شیخ عبد الحق کے حوالہ سے اپنی کتاب سفینۃ الاولیا میں یہ لکھا ہے کہ "از سرداران غازیان لشکر سلطان محمود غزنوی اند و از اہل اسلام در ہندوستان فتوحات بسیار نمودہ اند و بدرجہ شہادت رسیدہ شہادت ایشان در چہار صد و نوزدہ ہجری بودہ" کتاب قانون اسلام میں غازی میاں سے وہی شخص مراد لئے گئے ہیں جنکو رجب سالار کہتے ہیں۔ کتاب اخبار الاخیار میں اون سے مراد پیر تہیم (علیم ؟) ہیں جنہیں بعض پٹھان کہتے ہیں۔ زیادہ مفصل اور بظاہر زیادہ معتبر حالات اون کے کتاب مرآت الاسرار اور مرآت مسعودی میں مندرج ہیں یہ کتابیں شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں عبد الرحمن (عبد الرحیم) چشتی نے تصنیف کی تھیں جو تواریخ محمدی مصنفہ ملا محمد غزنوی سے ماخوذ تھیں۔ ملا صاحب محمود غزنوی کے ملازم تھے اور سالار موصوف اور آن کے پدر بزرگوار کے ہمراہ ہند میں آئے تھے۔ باوجود تلاش کے ان کتابوں کا پتہ نہیں ملا اور نہ قابل غور ملاحظہ نہیں۔ وہ ایک چھوٹے چھوٹے رسالے جو اس زمانہ میں دیکھے گئے ہیں اون میں حسن اعتقادی کا اسقدر زیادہ حصہ بھرا ہوا ہے کہ اصل حالات پر مشکل سے طبیعت جمتی ہے۔ ۱۲

پانچ برس کی عمر میں آپ سید ابراہیم نامی بزرگ کے سپرد کیے گئے اور ۹ برس کی عمر میں تمام علوم ظاہری و معنوی حاصل کر لیا۔ جب دس برس کے ہوئے تو عبادت الٰہی کا ذوق ہوا۔ شب کو بیدار رہتے۔ پہر دن چڑھے نماز چاشت و تلاوت کلام ربانی سے فرصت ہوتی۔ دیوان عام میں درولیان اہل باطن کے ساتھ صحبت رکھتے تقریر دلچسپ فرماتے ہمیشہ باوضو رہتے۔ غربا و مساکین کے ساتھ نرمی سے پیش آتے۔ عمدہ لباس اور خوشبو کا شوق تھا۔ تیر اندازی میں کمال حاصل تھا۔ آپ کے غزوات مشہور ہیں۔ ہندوستان کے بہت سے مشہور مقامات فتح کر لیے تھے۔

بہرائچ[۵] میں آپ کا مزار ہے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے۔ پھر بادشاہ نے بہرائچ جانے کا ارادہ کیا۔ یہ ایک خوبصورت شہر دریائے سرجو کے کنارے واقع ہے۔ یہ ایک بڑا دریا ہے جو اکثر اپنے کنارے گراتا رہتا ہے۔ بادشاہ شیخ سالار مسعود کی قبر کی زیارت کے لیے دریا پار گیا جنہوں نے اس نواح کے اکثر مقامات فتح کیے تھے۔ ان کی بابت عجیب عجیب روایات مشہور ہیں۔ پھر ہم نے آپ کی قبر کی زیارت کی۔ آپ کا مزار ایک برج میں ہے لیکن اژدہام کے سبب سے میں اس کے اندر داخل نہ ہو سکا +

[۵] بہرائچ کی وجہ تسمیہ میں دو خاص باتیں قابل لحاظ ہیں (۱) کہ برھما یچ (جماعت برھما) کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہاں برھما نے رشیوں کو آباد کیا تھا (۲) قدیم زمانہ میں یہ تمام ملک تھرؤں کے قبضہ میں تھا اکبر کے زمانے سے سرکار بہرائچ کا یہ صدر مقام ہو گیا ہے جس میں ضلع گونڈہ کا حصہ شامل تھا پہلی وجہ تسمیہ مقامی روایات سے گھڑی گئی ہے۔ البتہ دوسری وجہ معقول معلوم ہوتی ہے اور واقعات سے مطابقت کرتی ہے۔ ابوالفضل کہتا ہے "بزرگ شہر یست بر ساحل دریائے سرو۔ و سواد لبش دلکشا و باغ و مرغزار فراوان سالار مسعود و رجب سالار در آنجا آسودہ۔ و عامہ ہند از پیروان احمد کیش فر[illegible] دل ان اعتقاد و گنند و از دور دستہا بزیارت آیند۔ ازین علمہا بر سازند و انجمنہا آرایند نخستین خویشاوند سلطان محمود غزنوی است نقد زندگی بمردانگی سپرد و جاوید نام برگذاشت۔ دومین پدر سلطان فیروز مرزبان دہلی۔ از آراستگی ظاہر نیکنامی اندوخت۔

سالار موصوف کا زمانہ زیادہ تر چچا اور باپ کی صحبت میں گذرا۔ ۱۲۔ برس کی عمر میں آپ ہندوستان پر حملہ کرنے کی غرض سے روانہ ہوئے۔ گجرات میں اپنے زور بازو کے جوہر دکھلائے۔ سومنات میں جو نفیس مشورے سلطان کو دیئے اونکی وجہ سے یمین الدولہ کی نظروں میں آپکی وقعت اور بڑھگئی۔ یہانتک کہ محمود کا مدنظر غلام ایاز[۱] ان کو رشک حسد کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان سے چھپا کر اجے قنوج کی سفارش انہیں نے کی تھی تب کہیں جاکر اسکا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ الغرض سید سالار ملتان ہوکر دہلی آسئے اور پھر وہاں سے میرٹھ۔ قنوج ہوتے ہوئے ستر کہ واقع ضلع بارہ بنکی میں آئے اور یہیں مقیم ہو گئے۔ اور اپنے نائب اطراف وجوانب میں فتوحات حاصل کرنے اور مرید کرنے کی غرض سے روانہ کیئے۔ سید سیف الدین اور میاں رجب کو توال فوج۔ بہڑائچ کو جو ایک ویران جگہ تھی اسلئے روانہ کیئے گئے کہ وہاں سدہور اور امیٹھی سے رسد آیا کرتی تھی۔ عجب نہیں کہ سلطان محمود کی وفات نے ہندوستانی راجاؤں کے دلوں میں آزادی حاصل کرنے کی امنگ اور امید پیدا کردی ہو اور یہاں کے باشندے مسلمانوں کو خارج البلد کرنے کی غرض سے جمع ہو گئے ہوں۔ کیونکہ بیان کیا جاتا ہے کہ بہڑائچ کے امرانے ایکا کر کے مسعود کو دھمکی دی اور فوج اسلام کو اذیت پہونچانے لگے چنانچہ مسعود نے اسطرف کوچ کیا اور سنہ ۱۰۳۳ء میں پہونچگئے۔ قریب ہی ایک تالاب تھا اس کے کنارے پتھر کی تراشی ہوئی سورج کی مورت رکھی تھی۔ ہندوستان کے باشندے اس مندر کو مقدس

[۱] مشرقی قصوں میں یہ شخص اکثر ممتاز نظر آتا ہے۔ اور بہت سے لوگ اس کے باا ثر او صاحب اقتدار ہونے کی حالت میں بھی متواضع او منکسرالمزاج ہونیکے رطب اللسان ہیں۔ ہلالی کی مثنوی کا یہی خاص ہیرو ہے۔ دیکھو سلطان ٹیپو کے کتبخانہ کی فہرست صفحہ ۷ مرتبہ اسٹوارٹ صاحب لیکن فارسی کی مشہور کتاب محمود نامہ جو ہندوستانی بچے اکثر پڑھتے ہیں عنصری کی تصنیف سمجھی جاتی ہے ۱۲

مانتے تھے، مسعود کا جب ادھر گذر ہوا تو اونہوں نے اپنی سکونت کے لیے اس جگہ کو پسند کیا اور اکثر فرماتے تھے کہ میں روحانی آفتاب کی قوت سے اس مادہ پرستی کو غائب کردوں گا۔ اس ملک کے سردار پہلے تو اس نوجوان جانباز کی موجودگی سے سراسیمہ ہوئے لیکن پھر اونہوں نے دل کو مضبوط کیا اور دریائے کوسالا یا کوڑیالا کے ساحل پر ایک خاصی فوج جمع کر دی۔ مسعود نے کئی بار انکو شکست دی لیکن شاہور دیو (سہیل دیو؟) کی آجانے سے فتح کی شکل تبدیل ہوگئی۔ مسعود کو شکست ہوئی اور ۱۸۔ رجب المرجب ۴۲۴ھ ہجری کو جبکہ سن ۱۹ برس کا تھا میدان کارزار میں جام شہادت نوش کیا۔ بیل صاحب کہتے ہیں چوں بطرف بہرائچ متوجہ گردید بسبب آنکہ ہوا گرم بود و ساعتی در زیر درخت گلچکاں کہ قریب تبکدہ سورج کنڈ بود نشست و سورجکنڈ معبدگاہ اہل ہنود بود و صورت آفتاب را بر سنگ تراشیدہ آنجا گذاشتہ بودند از آں سبب سورجکنڈ میگفتند و تمام ہندوان بجہت پرستش مخصوص بروز یکشنبہ می آمدند و آں را بالارکھ نیز میگفتند۔ وشہر بہرائچ بنام او آباد ساختہ بودند الحملہ چوں مسعود غازی ساعتی زیر آں درخت نشست گفت کہ سایہ این درخت مرا بسیار خوش آمدہ مناسبست کہ درینجا باغی تیار شود پس فرمود جہتاے کہنہ کہ پیش سورجکنڈ است ہمہ را ویران ساختہ زمین را ہموارہ کنند و یک چبوترہ وسیع زیر درخت گلچکاں تیار نمایند و تبکدہ را بحال داشتہ گردیگر دآں درختہا و نہال نصب کنند پس درختے روز باغ آراستہ گردید۔ درین عرصہ چندبار ہندوآں بر جمع شدہ غنیم بودند تا آنکہ بتاریخ چہاردہم ماہ رجب کہ روز جمعہ بود و سال چہار صد و بست و چہار ہجری جنگ شروع گردید بسیار از مردان از ہر دو جانب کشتہ شدند اکثر از شہدا را در حوض سورجکنڈ و بعض را در چاہ انداختہ خاکپوش کردند۔ بعد ازاں سالار مسعود غازی نیز بزخم تیر کہ بر شہ رگ آمدہ نشستہ بود شہادت یافت وزیر بسر

دزدیدن نگاہ کال او را قرض نمودند. او دران وقت نوزدہ سالہ بود بعد از وقوع این واقعہ ہندوان غلبہ نمودہ ہر جا کہ اہل اسلام را میافتند شہید میکردند۔ عزیزے در تاریخ ولادت ووفات او این ابیات گفتہ۔

تاریخ

محبوب خدا بود امیر مسعود | در چار صد و چہار آمد بود
چون تا سلبت در چہارش افزود | در چار صد و بست و چار رحلت فرمود

مشہور واقعہ سید سالار کے اس حملہ اور احمد نیالتگیں کے حملہ واقعہ سنہ ۴۲۴ء میں یک قسم کا تعلق پاتے ہیں۔ یہ مہم جیسا کہ تاریخ سبکتگین مصنفہ ابوالفضل بیہقی (سنہ ۱۰۵۷ء) میں لکھا ہی بنارس پر ہوئی تھی۔ لیکن اودہ کا ملک مطیع کیئے جانیکا کوئی تپہ نہیں ملتا۔ نہ ان دونوں حملوں کے مطابقت سے کوئی خاص بات پیدا ہوتی ہے اور اس قیاس کی تو کوئی بنیاد ہی نہیں ہے کہ مسعود کا حملہ نامور احمد بن محمود کے حملہ کا جز تھا بیانہ میں جو دہلی سے ۳۰ میل جنوب کیطرف اور ۲۰ میل بھرتپور سے جنوب و مغرب کیطرف واقع ہے ابو بکر قندھاری کی خانقاہ بہت مشہور ہی جنہوں نے سنہ ۶۱۲ ہجری کے قریب بیانہ پر فتح پائی ہے۔ یہی زمانہ بہرام بن مسعود غزنوی کی تخت نشینی کا تھا جس کے اوائل عہد حکومت میں غزنوی لشکر ہندوستان میں آیا ہی۔ مترجم عجائب الاسفار کی یہ رائے کہ سالار مسعود غازی اسی لشکر کے سردار معلوم ہوتے ہیں کیونکہ بیانہ کے قلعے کا فتح ہونا ان کے ہاتھ پر بیان کیا جاتا ہی اس لیے اور بھی زیادہ قابل غور ہے کہ گزیٹیر میں بھی بیانہ کے حال میں لکھا ہے "بیجے پال کو جسکی اولاد اسوقت دہلی میں حکومت کر رہی ہے مسعود سالار محمود غزنوی کے بھانجے نے گیارہویں صدی کے وسط میں قتل کیا اور راجپوتوں کا دوبارہ قبضہ ہوجانے پر ابوبکر قندھاری نے تاخت و تاراج کیا" خراسان اور ہندوستان دونوں مقامات میں مسعود کو اکثر رجب سالار کے نام سے ذکر کیئے جانیکا سبب زیادہ تر یہ ہے کہ بہرائچ میں اس شخص کی بھی قبر موجود ہی

اور سالار کے لفظ نے جو دونوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے ان لوگوں کو جنہوں نے کافی طور پر اس مسئلہ پر توجہ نہیں کی غلط فہمی میں ڈالدیا ہے۔ رہا یہ امر کہ جب سالار کون بزرگ ہیں بجائے خود مشتبہ بات ہے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ انہیں سالار مسعود کیطرح شہادت کا کوئی دعوی حاصل نہیں ہے۔ ابوالفضل نے صوبہ اودہ کے ... اور فیروز شاد کے باپ ہے۔ تاریخ فرشتہ اور شمس سراجیہ سے بھی اس فقرہ کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن یہ امر تصدیق نہیں ہوتا کہ اون کا انتقال بہرائچ کے قرب وجوار میں ہوا یا وہاں دفن ہوئے البتہ مرآت مسعودی میں صاف طور پر لکھا ہے کہ جب مسعود کے ہمراہیوں میں سے تھے اور چونکہ اون کی اراضی معافی ناحق ضبط ہوگئی تھی اسلیئے وہ قسمت آزمائی کی غرض سے ہندوستان میں آئے تھے اور مسعود کے لشکر کے کوتوال مقرر ہوئے اور بہرائچ میں دفن ہوئے اسلیئے یہی آخری شخص جب سالار ہو سکتے ہیں جنکو اکثر غازی میاں کہا جاتا ہے۔

صوبہ متحدہ کے زراعت پیشہ اور نیچ قوموں میں غازی میاں کا بہت شہرہ ہے اون کا اور اون کے بھانجے (جیسا کہ کہا جاتا ہے) ہٹیلی صاحب کا شمار پنج پیروں میں کیا جاتا ہے۔ ہٹیلی صاحب بھی سالار مسعود کے روضہ کے قریب ہی مدفون ہیں۔ ان کی بڑی بڑی یادگاریں تعمیر کی گئی ہیں۔ انکا نام ہاتھی سے اخذ کیا گیا ہے کیونکہ یہ بڑے جسامت کے شخص تھے۔ ان کے نام سے کئی مواضعات میں میلے ہوا کرتے ہیں غازی میاں نے باوجود اس کے کہ بت پرستی کے معدوم کرنے میں کوئی دقیقہ کوشش کا اوٹھا نہیں رکھا تاہم ہندو بھی انکی پرستش ویسی ہی کرتے ہیں جیسی کہ مسلمان۔ بہرائچ میں سید سالار کی درگاہ خاص دلچسپی کی چیز ہے۔ جو قصبہ سے ۲ میل کے فاصلہ پر موضع سنگھہ پاراسی میں واقع ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ درگاہ اوسی جگہ بنی ہے جہاں کہ پہلے سورج کا مندر تھا۔ سید جمال الدین ساکن رودلی واقع ضلع بارہ بنکی

کی تابینا دختر زہرہ بی بی نے سید سالار کے مزار کی زیارت کرنے کے بعد جب بارہ
برس کی عمر میں بینائی حاصل کی تو وہ اپنے بھائی سید محمد کے ہمراہ بہرائچ آئی اور
وہی سنے یہ درگاہ تعمیر کرائی - اوس سنے اپنے لئے بھی یہیں مقبرہ بنوایا - ۱۸ برس کی
عمر میں اسکا انتقال ہوا تو یہیں دفن ہوئی - اوسکی ماں اور دیگر اعزا ہر سال اوس کی
قبر کی زیارت کرتے اور مثل شادی کے تقریب مناتے اور کہتے کہ ہم لکتخدائی زہرہ
بی بی کی شادی شہید سالار مسعود کے ساتھ کر رہے ہیں جنکی شادی نہ ہونے پائی تھی
کہ شہید ہو گئے - یہہ زیارت رفتہ رفتہ اہمیت پکڑتی گئی اور وہ مقبرہ ایک مقدس جگہ
سمجھا جانے لگا - سنہ ۷۷۶ھ میں شہنشاہ فیروزشاہ بہرائچ میں وارد ہوا - اور اوس سنے
درگاہ کی چہار دیواری اور دیگر عمارات تعمیر کرائیں - اوس زمانہ میں وہاں ایک اور
درویش سیرماہ نامی رہتے تھے اونہیں ہی بادشاہ سنے مورد عنایات خسروانی
کیا اور درگاہ کے اخراجات اور کفالت کے لیے ایک جاگیر عطا کی سیرماہ کا مقبرہ
درگاہ کے قریب واقع ہے اور رجب سالار کے مقبرہ کی طرح وہ بھی مقدس سمجھا
جاتا ہے - ایک اور مورخ کا بیان ہے کہ سید سالار کی درگاہ ملک ناصرالدین محمد
سلطان شمس الدین التمش کے خلف اکبر نے بنوائی تھی درگاہ کے اندرونی حصار کے
دیوار و پیر تابنے کی تختی پر جو کتبہ ہے اوس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر شاہ ثانی نے اس
موضع کو بطور جاگیر عطا کیا تھا - درگاہ کے مالخانہ میں اسیطرح کی دو اور تختیاں ہیں
جنمیں سے ایک بندہ علیخاں کیطرف سے سنہ ۱۱ ہجری کا اور دوسری مہدی علیخاں
کی طرف سے سنہ ۱۲۱۵ھ کا میلہ اور درگاہ کے محاصل کی معافی کا فرمان ہیں -

یہہ جگہ ایک زمانہ دراز سے زیارتگاہ بنگئی ہے اور وہاں سالانہ ماہ جیٹھ کے
اول یکشنبہ کو جبکہ آفتاب برج ثور میں پہونچتا ہے ایک میلہ ہوتا ہے جسمیں ایک لاکھ
کے قریب آدمی جمع ہوتے ہیں - اسمیں اکثر ہندو ہوتے ہیں - یہہ لوگ کئی رات جاگا کرتے

اور بڑی ہو حق مچایا کرتے ہیں۔

لطیفہ ۔ بیل صاحب نے اکبر کا ایک واقعہ ابوالفضل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ روزے از زبان اقدس حضرت شاہنشاہی یعنی اکبر شاہ شنیدم کہ شبے در نواحے آگرہ ایں ہمہ ہنگامہ گرم بود بہ تقریب شہر کر یہ بطرز خاص عبور ربانجا باتفاق افتاد برشیون احوال مردم طرح تماشائی بودہ کہ ناگاہ یکی از اوباش مرا شناختہ بدیگرے گفت کہ این بادشاہ است چوں برایں معنی مطلع شدم بزودے چشم خود را گردانیدہ کاژ نماساختہ و تغیرے روے بوضعی غریب کردم و بطوری کہ آنہا نفہمند تماشا ئے بودہ نظارگیِ فنونِ نفاد بودم چوں آں مردم نیک بمن نگاہ کردند بجہت آن تغیر مرا شناختہ با یکدیگر گفتند کہ این چنیں چشم و روے بادشاہ نیست و من آہستگی از آں معرکہ براٰمدہ و بمحفل مقدس آمدم"

میلہ کے موقع پر بڑے بڑے نشان نہایت شان و شوکت سے نکالے جاتے ہیں جس کے سر پر بالونکا گچھا لگا ہوتا ہے جو اس شہید کا سر سمجھا جاتا ہے اور اسکی نسبت کہا جاتا ہے کہ جسم سے علیحدہ کیے جانیکے بعد عرصہ تک گھومتا رہا۔ اوسیجگہ گرہ میں سکہ بندھا ہوتا ہے۔ اگر زائر کی منت پوری نہیں ہوتی تو وہ اپنا نشان واپس لیجاتا ہے اور اگر پوری ہوجاتی ہے تو وہیں چھوڑ جاتا ہے یہ میلہ اکثر بڑے قصبوں میں ہوتا ہے لیکن زیادہ اژدہام بہرائچ میں ہوتا ہے۔ اور غازی میاں کے بیاہ کے نام سے مشہور ہے۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ وہ شادی کا جامہ زیب تن کیے ہوئے تھے جب شہید ہوئے۔ مرآت مسعودی سے صرف یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وفات سے ایک شب قبل انہوں نے خواب میں دیکھا کہ انکی ماں نے آکر شادی کا سہرا اون کے سر پر رکھدیا جو تاج شہادت کی علامت ہے جس سے وہ اگلے دن عزت حاصل کرنے والے تھے۔ آرایش محفل میں لکھا ہے کہ رودولی کے تیلی نے سب سے پہلے یہ دستور قایم کیا تھا۔ وہ ہر سال پلنگ پیڑہی اور دیگر سامان جہیز بہرائچ لیجاتا تھا۔ اُسے یہ گمان تھا کہ غازی میاں ہر سال شادی کی رسم ادا کرتے ہیں۔ کم و بیش انہیں جو مسعود انہیں گجنا دولہا اور سالار چھنولا کہتے ہیں۔

مسٹر گارسن ڈی تاسی اپنی کتاب ہندوستان کے مسلمانوں کے مذہب کی یادداشت کے صفحہ ۱۸ میں لکھتے ہیں کہ مسٹر ایچ ایچ ولسن اسی شادی کی نسبت اپنا شبہ ظاہر کرتے ہیں کہ بجائے شہادت کے لفظ شادی غلطی سے تحریر ہو گیا ہے لیکن اس خط کی صحت یا ہم پر بحث کا کوئی موقع نہیں ہے۔ سکندر لودھی نے بت پرستی کی علامت سمجھ کر اس میلہ کو بند کرنا چاہا لیکن اُسے کامیابی نہ ہوئی۔

میلہ کی خصوصیات میں قابل ذکر بات چڑھاوا ہے جو مختلف قسم کا ہوتا ہے اونمیں سے ایک کو پلنگ پیڑھی کہتے ہیں جسے شادی کا جہیز سمجھنا چاہیے۔ رُوڈلی بنارس۔ جونپور۔ اور مرزا پور کے زایرین نقدی بطور نذر کے دیتے اور زہرہ بی بی کا جہیز کہتے ہیں۔ دوسری نذر مزار شریف کا چڑھاوا کہلاتا ہے۔ دستکار اور سوداگر بظاہر شکرانے کے طور پر نقد یا جنس تجارت کی شکل میں دیتے ہیں۔ یہ نذر سال کی آمدنی کہلائی جاتی ہے۔ تیسری قسم کی نذر کو قلندری کہتے ہیں۔ یہ سکے ہوتے ہیں جنہیں زایرین مقبرہ کے قبہ پر پھینکتے ہیں۔ اور اگر پھینکتے وقت کلس پر لگ جائے تو خوش نصیبی سمجھتے ہیں۔

پہلے اس درگاہ کا انتظام خدام کے ہاتھ میں تھا جو سالار موصوف کے ملازمین کے مشہور اولاد تھے ۱۸۷۶ء سے ایک کمیٹی کے تعلق ہو گیا ہے۔ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر اس کے نگراں ہیں۔ درگاہ کی مالی حالت اب بہتر ہے اور اس سے ایک اسکول اور ایک اسپتال قایم ہے جو اسلامی اوقاف کا صرف خیر سمجھنے چاہییں +

(المحمود)

آپ بھلے تو جگ بھلا

خود غرضی ہر وقت اور ہر جگہ ہر ملک میں اور ہر قوم میں انسانی کیرکٹر پر ایک بدنما دھبہ مانی گئی ہے۔ انسان صرف قوت متخیلہ کے بھروسہ پر بہترین مخلوق ہونیکا مدعی ہے۔ اگر یہ قوت ممیزہ اس میں معطل کر دی جائے تو وہ نہ صرف ایک قسم ہے حیوان کی بلکہ نِچ مِچ حیوان ہے فراست ہی وہ مابہ الامتیاز شے جس نے انسان اور دوسری مخلوق میں ایک تمیز قایم کر دی ورنہ کتا سب سے بہتر انسان تھا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ یہ اطلاق جائز نہو۔ یہی اصول مد نظر رکھکر محققین کا ایک گروہ اس طرف جھک گیا کہ تجرد حیات انسانی کے واسطے سب سے بہتر چیز ہے اس رائے کی صحت ثابت کرنے کی تفصیلی وجوہ جو کچھ بھی ہوں مگر انکا ماحصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ مناکحت سے جو جڑ ہے تمام ذمہ داریوں کی اگر پرہیز کیا جائے تو تعلقات کی تازہ ضرورتیں اور نئی خواہشیں نہ پیدا ہونگی اور اسطرح اغراض محدود رہیں گی لیکن یہہ اصول اگر عام طور پر قابل تسلیم سمجھا جاتا تو ادھر بقاء نسل ادھر لطف حیات غرضکہ دونوں چیزیں مفقود تھیں اور فطرت کا وہ قابل ناز تحفہ جو عورت کے نام سے تعبیر کیا گیا ایک بیکار شے تھی۔ تاریخ۔ تمدن ترقی۔ تہذیب سب کا خاتمہ تھا اور ہر وہ قوم جو آج باعتبار معاشرت معراج کمال پر ہے کبھی تھی یا آیندہ ہوگی افریقہ کے وحشیوں سے افضل نہوتی۔ اسی فطرتی انعام یعنی قوت مابہ الامتیاز نے آخر اپنا کام کیا اور انسان نے اپنی زندگی کو پر لطف اپنی انسانیت کو کامل اپنی عمر کو نعمت بنانے کے واسطے توسیع تعلقات کی ضرورت محسوس کی اس مقصد کی کامیابی کا انحصار صرف اُس شے کی محبت پر تھا جسمیں موسیقی جسمیں شاعری جسمیں مادہ تسخیر موجود ہو اس خریت کو

ہو اگر نے کے واسطے کائنات میں سے کوئی شے عورت سے بہتر نہ تھی اور یہی تھی وہ شے جسنے مرد کے ساتھ مل کر قوموں اور ملکوں کو دیکھنے دکھانے کے قابل بنا دیا۔

اسی خیالی طبقہ میں بعض روحیں ایسی بھی شریک ہوئیں جو مقاصد حیات کی تہ کو نہ پہونچ سکیں اور دائرہ زندگی تنگ کرتے کرتے صرف اپنی اغراض کی تکمیل پر محدود کر دیا۔ قوم انکی طرف سے غارت ہو ملک انکی طرف سے برباد ہو دنیا انکی طرف سے نیست نابود ہو۔ کوئی مرے کوئی جیئے بہین بچے انکی بلا سے بیوی جاہل رہے۔ بچے خاک اڑاتے پھریں مگر جب اپنے پیٹ میں پڑ گئی تو آپ بھلے تو جگ بھلا۔ ان ہی خودغرض بزرگوں کی شان میں سعدی علیہ الرحمۃ فرماتی ہیں

بمیر آں بے حمیت را کہ ہرگز   نہ خواہد دید روئے نیک بختی
تن آسانی گزیند خویشتن را   زن و فرزند بگذارد بہ سختی

اُس سے زیادہ خودغرض کون ہوگا جو اپنی خواہشوں کو اپنے بیوی بچوں سے بھی مقدم سمجھے اور یہہ یقین کرے کہ جب ہم مر گئے تو ہمارے بعد بیوی اور بچے بھیک مانگیں تو کیا اور عیش کریں تو کیا عورت جو قدرت کا سب سے زیادہ بیش قیمت تحفہ تھی بیوی نہ کہ ان نفس کے بندوں کی محکوم ہوگئی۔ صبر چونکہ اسکا شیوہ اور شرم وحیا اس کے جوہر تھے وہ اپنے حقوق کے واسطے زبان تک نہ ہلا سکی جو ظلم ہوئے اُٹھائے اور جو زیادتیاں ہوئیں انگیز کیں نتیجہ بجائے اسکے کہ یہہ ہوتا کہ مرد اپنے گریبان میں منہ ڈالتے۔ کمزور ونپر اور شیر ہو گئے نوبت یہانتک پہونچی کہ جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنے لگیں۔ اِس خودغرضی اِس غفلت اور اِس لاپروائی کا انجام جو ہونا چاہیے تھا وہ ہوا دنیوی نشیب و فراز کا سب سے بہتر صلاح کار عیش و نشاط کا سب سے بڑا شریک غم الم

میں سب سے زیادہ غمگسار۔ المختصر عمر کا سب سے اچھا رفیق یعنے بیوی محض بچے پال دینے کی ایک شے رہ گئی +

اس مظلوم نائی گود سے جب علم کی روشنی پڑنی گناہ جسکو کسی معاندین رائے دینی حسرام جو پالن جی کی تابعدار اور حکم کی نوکرتی جیسے بچے پلتے ہیں وہ ظاہر ہے اور آج ادبار قوم اسی دلیل کا ثبوت ہے۔

ہر شخص بجائے خود اس مسئلہ پر غور کرسکتا ہے اور دیکھہ سکتا ہے کہ اپنی آمدنی کا کسقدر حصہ وہ اپنی اغراض پر صرف کر رہا ہے اور کسقدر اپنی بے زبان بیوی اور معصوم بچوں پر۔ کون ایسا ہوگا۔ جو یہ نہیں سمجھہ سکتا کہ یہہ چار دیواری میں زندگی بسر کرنے والیاں اگر سونے چاندی کے ساتھہ ہی علم کے زیور سے بھی آراستہ کی جائیں تو خاوندوں کی زندگی کو جنت بنا دیں گی انکی گود میں پھلنے پھولنے والے بچے ایسے خیالات لیکر نکلیں گے جو عمر کے ہر حصہ میں کار آمد ہوں یہہ دقیانوسی الجھنوں میں رہنے والیاں اگر علم کیطرف متوجہ کی جائیں تو فرمانبردار بیٹیاں کفایت و سلیقہ شعار بیویاں بنیں گی۔

کواری بیٹیاں جنکو اپنی عمر بسر کرنی ہے اگر میکے ہی سے جہالت و توہمات میں جکڑی ہوئی سسرال گئیں تو وہ کیا گھر کریں گی اور کیا گھر کا انتظام۔

جہاں خاوندوں کا یہ فرض ہے کہ وہ بیویونکو اِس قابل بنا دیں کہ بچونکی پرورش جسپر چند بندگان خدا کی آیندہ زندگی کا انحصار ہے خانہ داری کا انتظام جس سے اونکی محنت و مشقت کی پیدا کی ہوئی آمدنی نیک لگے اور وقت پر کچھہ پاس بھی نکل آئے۔ طریق معاشرت جس سے اُنکی اپنی امیدیں اور خوشیاں متعلق ہیں ایسی معقول ایسا کامل ایسا مناسب ہو کہ بچے عمر بہر دعا دیں۔ عزت سے زندگی بسر کریں آپ کسی کے دست نگر ہوں گہر میں گھسیں تو کسی قسم کی

وقت نہو وہاں والدین اور خصوصاً باپ اسکا ذمہ دار ہے کہ بیٹی جو آگے چل کر ایک چھوٹی سی سلطنت کی حکمراں ہوگی جس کے خیالات معصوم بچوں میں بیج کی طرح پڑیں گے کم سے کم اس قابل تو ہو کر سسرال جائے کہ وہ اپنی ذمہ داریاں سمجھ سکے و فرائض انجام دے سکے اور سچی بیوی کہلائی جا سکے +

اسوقت گنتی کے چند آدمیوں کے سوا عام طور پر بزرگانِ قوم تعلیم نسواں کی ضرورت کو محسوس کر رہے ہیں اور یہ فیصلہ قطعی ہے کہ جبتک خواتین علم سے مستفیض نہ ہونگی ہماری ترقی محال ہے۔

اسی اصول کو مدنظر رکھکر میں نے رسالہ عصمت کا اجرا کیا۔ کیونکہ جو زنانہ اخبار و رسائل اسوقت شائع ہو رہے ہیں انہوں نے کامیابی کا ذریعہ زیادہ تر یہی سمجھا کہ کسی طرح چکنی چپڑی باتوں سے خواتین کے دلمیں گھر کرلیں۔ اور بلا ضرورت و قبل از وقت انکو ایسے حقوق کیطرف متوجہ کریں جنکا حاصل ہونا تو معلوم البتہ نمغۂ خیر خواہی حاصل ہو جائے۔ خواہ یہ نشتا باگھروں کو پھونک کر خاکسیاہ کیوں نہ کردے عصمت کے جاری کرنے سے میری سب سے بڑی غرض یہ تھی اور ہے کہ خواتین رفتار زمانہ سے اچھی طرح واقف ہو کر اپنے جائز حقوق حاصل کرنیکی مردوں سے درخواست کریں مگر معقول طریقے سے اور نرم لہجہ میں یہ نہیں کہ ایسی درخواست جو آیندہ زندگی کو تلخ و برباد کردے +

عصمت کا منشا جہاں بیٹیونکو سعادتمند بیویونکو منتظم بنانا ہے۔ وہاں عورتوں میں ایک ایسی روح پھونکتا ہے جس سے وہ اپنے فرائض سے خبردار اور زمانہ کی ضرورتوں سے ہشیار ہو جائیں۔ لیکن مجھے یہ دیکھکر افسوس ہوتا ہے کہ ابتک قوم نے پوری طرح اس ضرورت کو محسوس نہ کیا۔

اخواتین کی تعلیم سے غفلت اگر سر پر ایک گناہ لینا ہے تو آئندہ نسلوں کو جان بوجھ کر کنوئیں میں دھکا دینا اور اگر میرا خیال غلط ہے اور یہ ضرورت محسوس ہو گئی تو ابھی وہ آنکھیں پیدا ہوئیں جو رفتار زمانہ کی کسوٹی پر رکھکر کھرا کھوٹا پرکھیں +

عصمت کا ہر مضمون اس قابل ہے کہ اگر کواری لڑکیاں دیکھیں تو ان کی زندگی کا رہنما ہوگا۔ بیاہی ہوئی لڑکیوں کو اچھی زندگی بسر کرنی بتائے گا۔ ماؤں کو پرورش کے طریقے بیویوں کو کفایت شعاری کی تدبیریں سکھائیگا ساس بہوؤں کے تعلقات کو درست کرے گا۔ بہنوں کو بھائیوں کی محبت سکھائیگا۔ الغرض عصمت ہر لڑکی ہر بیوی ہر بہو ہر بہن اور ہر ما کے واسطے سہیلی ہوگی۔ ناصح ہوگا۔ "چار آنہ میں عصمت ایک نعمت ہے" ناظرین دیکھیں گے کہ عصمت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جہاں وہ خواتین میں نئی تہذیب پیدا کر رہا ہے وہاں اسکی بڑی کوشش یہ ہے کہ اصلی جوہر ہاتھ سے نہ جانے پائیں اور وہ خوبیاں جو اگلے زمانہ والیوں میں تھیں اور آج جہالت سمجھی جا رہی ہیں رخصت نہ ہو جائیں۔

ماہ گذشتہ کے رسالے سے ایک مضمون نقل کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ مضمون کس پایہ کا ہے یقین ہے کہ ناظرین مخزن کی دلچسپی کا باعث ہوگا + محمد اکرام

آفتاب رسالت مولوی عبید السبحان صاحب نے اس کتاب میں پیغمبر اسلام صلعم کی مقدس زندگی کے حالات نہایت خوبی سے بیان کیے ہیں ہمیں صاحب کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ یہ کتاب درحقیقت اس قابل ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی جلسوں و مولود شریف کی محفلوں میں پڑھی جائے۔ قیمت ۸؍ مؤلف سے کلکٹری ہمیر پور سے ملتی ہے۔

شاعر باکمال حضرت جلال لکھنوی مرحوم

آپ کا اسم مبارک میر ضامن علی اور تخلص جلال تھا آپ کے والد کا نام اصغر علی تھا۔ بزرگوں سے آپ کا آبائی کاروبار طبابت سے ہے جسمیں آپ کے خاندان کا ہر ایک ممبر اپنے زمانہ میں مشہور و ناموررہا ہے۔ آپ سنہ ۱۲۴۸ ہجری بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے لکھنؤ میں وہاں کے علما سے ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل کی اور آخر لکھنؤ ہی کی خاک پاک میں خاک ہوئے۔

اوائل عمر میں ہی آپ کو شاعری کا شوق تھا چنانچہ خدائے سخن شیخ امام بخش ناسخ مرحوم مغفور کے شاگردان رشید جناب میر علی اوسط صاحب رشک اور فتح الدولہ بہادر مرزا محمد رضا صاحب برق لکھنوی کی شاگردی کا فخر حاصل کرکے اس فن میں ایسا نام پیدا کیا کہ صف آخرین کے شعرا میں مسلم الثبوت اور مستند اوستاد مانے گئے +

جب سنہ ۱۲۷۱ھ میں نواب یوسف علیخاں رامپور کے فرمانروا ہوئے اور سنہ ۱۸۵۷ء کے غدر کا دور دورہ ختم ہوا تو آپ کے والد دربار رامپور کے طبیب ہوئے اور حضرت جلال بھی اپنے والد کے ذریعے سے وہاں پہونچکر ملازم سرکار و لتمدار ہوئے اور برابر پچیس ۲۵ برس تک ملازم رہے۔ جب آپ کی شاعری کا آغاز ہوا تو اوسوقت حضرت ناسخ اور آتش وغیرہ کی سحر بیانی سے شاعری درجۂ کمال کو پہونچی ہوئی تھی۔ بس کیا تھا آپ بھی دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگے۔ جب سنہ ۱۲۸۱ ہجری میں نواب مذکور الصدر کا انتقال ہوا اور اون کی جگہ نواب کلب علیخاں ہوئے تو شاعری کا بازار خوب گرم ہوا بہت سے

ناموری شاعر مثلاً اسیر۔ بحر۔ منیر۔ امیر۔ جلال۔ داغ۔ سرور۔ قلق وغیرہ ملازم رکھے گئے چنانچہ سخن کی خوب خوب معرکہ آرائیاں اور شعر کے دہلی ولکھنؤ کی بحثیں ہوتی رہیں اسی کے لیے وہی زمانہ موزوں تھا۔ جب سنہ ۱۳۰۱ھ میں شاہ وقت اور اہل کمال کے قدر دان نواب کلب علی خاں نے رحلت فرمائی تو شعرا شیرازہ بھی بکھرا چنانچہ جلال صاحب بھی اپنے وطن لکھنؤ کو واپس آ گئے مگر کچھ از روئے قدردانی والیٔ منگرول علاقہ ملک کاٹھیاواڑ نے آپ کو طلب کیا آپ وہاں نہایت اعزاز و اکرام سے چند سال تک ملازم رہے مگر منگرول میں بہت کم رہے بیشتر لکھنؤ ہی میں رہا کئے۔ والیٔ منگرول بمقتضائے قدردانی گھر بیٹھے سو روپیہ مہینہ آپ کو بھجوایا کئے بعد چند سال کے وہاں سے بھی سلسلہ ملازمت قطع ہو گیا۔ پھر مدت تک توکلت علی اللہ تعالیٰ محض عنایت خدا پر تکیہ کئے اپنے وطن لکھنؤ محلہ منصور نگر میں خانہ نشین رہے درحقیقت والیٔ رامپور کے اوستاد آپ ہی تھے کیونکہ آپ ہی نے اون کو جملہ رموز شاعری سے آگاہ کیا تھا۔

جب سنہ ۱۲۹۶ھ میں آپ کے سر سے آپ کے والد کا سایہ اوٹھا اور اوس کے دوسرے سال آپ کے بھائی حکیم میر ضامن علی نے انتقال کیا تو اوس وقت آپ رامپور ہی میں ملازم تھے آپ کے والد کی زندگی میں یعنی سنہ ۱۲۹۰ ہجری میں آپ کے پہلے فرزند نے رحلت کی جسکا مادہ تاریخ آپ نے ”ہے ہے لخت جگر“ نکالا۔

آپ کے انتقال سے جو صدمہ بیچاری اردو زبان کو پہونچا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ کیونکہ آپ ہی کے دم سے رہی سہی شاعری کا نام زندہ تھا۔ آپ نے اِس فن شریف میں وہ تحقیق و کمال حاصل کیا کہ دوسروں کو نصیب نہ ہوا۔ چنانچہ یہ چند کتابیں آپ کی تصنیف و تالیف سے چھپکر مقبول عام

ہو چکی ہیں :-

(۱) دیوان اول موسومہ شاہد شوخ طبع - یہ دیوان آپ کی شاعری کا پورا رنگ ظاہر کرتا ہے جو سنہ ۱۲۹۷ ہجری میں مرتب ہو کر سنہ ۱۳۰۱ھ میں طبع ہوا

۲- دیوان دوئم موسومہ کرشمہ گاہ سخن - یہ دیوان بھی آپ کی شاعری کا عالم شباب ظاہر کرتا ہے جو سنہ ۱۳۰۱ھ میں مرتب ہو کر سنہ ۱۳۰۲ھ میں طبع ہوا

۳- دیوان سوئم موسومہ مضمونہائے دلکش - اِس دیوان سے آپ کی شاعری بوڑھی نظر آتی ہے جو سنہ ۱۳۰۹ھ میں واسلیے منگرول کی مدت ملازمت کے زمانہ میں طبع ہوا اِس دیوان میں آپنے چند خاص الفاظ کو متروک قرار دیا ہے +

۴- دیوان چہارم موسومہ نظم نگارین - اِس دیوان پر آپ کی شاعری کا خاتمہ ہوتا ہے جو سنہ ۱۳۲۱ھ میں طبع ہوا گویا یہ آپ کی آخری تصنیف ہے

۵- رسالہ مفید الشعرا بحث تذکیر و تانیث میں - یہ رسالہ پہلے سنہ ۱۲۹۳ھ میں کار آمد شعرا کے نام سے طبع ہوا تھا اُسوقت آپ کو رامپور میں ملازم ہوئے بیس بائیس سال ہوئے تھے یہ رسالہ تذکیر و تانیث کا دنیا میں سب سے پہلا رسالہ ہے اور باقی سب اس کی بنیاد سے کھڑے ہوئے ہیں +

۶- سرمایہ زبان اُردو تحفۂ سخنوران (اُردو کا مبسوط لغت) یہ لغت سنہ ۱۳۰۴ھ میں طبع ہوا اِسکو بھی اُردو زبان کا سب سے پہلا لغت کہلانے کا فخر حاصل ہے اور باقی سب لغت اِس کے فیض یافتہ ہیں -

۷- رسالہ افادۂ تاریخ - (بحث تاریخگوئی میں) یہ رسالہ سنہ ۱۳۰۲ھ میں مرتب ہو کر سنہ ۱۳۰۳ھ میں طبع ہوا اگرچہ اسپر منشی انوار حسین صاحب تسلیم سہسوانی

بے جا اعتراضات کر کے ایک تو کتاب کا حجم بڑھایا ہے اور دوسرے خاص کاوش نکالی ہے مگر السابقون السابقون کا کلمہ افادہ ہی پر صادق آتا ہے

۸۔ رسالہ منتخب القواعد دالفاظ ہندی الاصل کی تحقیق میں جو ۱۳۰۲ھ میں مرتب ہو کر ۱۳۱۱ھ میں طبع ہوا۔ اگرچہ اس رسالہ کا حجم بہت تھوڑا ہے مگر زبان اُردو کے قواعد و احوال میں پہلا رسالہ ہونے کا فخر بھی اسی کو حاصل ہے۔

۹۔ گلشن فیض (لغت مبسوط اُردو جس کا بیان عبارت فارسی میں ہے)

۱۰۔ تنقیح اللغات (الفاظ عربی و فارسی و ہندی وغیرہ کی تحقیق میں)

آپ اپنے ہمعصر شعراء جناب امیر مینائی مرحوم اور جناب داغ دہلوی مغفور سے بہت اُنس رکھتے تھے اگرچہ تخلص کے اشتراک اور علم و کمال کے لحاظ سے آپ کی طبیعت میں تعلّی بہت تھی۔ مگر پھر بھی داغ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے اکثر مجھے لکھا کرتے تھے کہ اُن کے دیوان اول کے مجھے بہت سے اشعار پسند ہیں۔ ایک خط لکھنے کا طریق بھی قدیمانہ طرز کا تھا یعنے خاتمہ پر اپنے آپ کو جلال بیکمال لکھا کرتے تھے اور لفافہ پر مکتوب الیہ کا نام و پتہ لکھنے سے پہلے عین وسط میں بعونہ تعالیٰ شانہٗ کے پاک الفاظ تحریر فرمایا کرتے تھے۔ آخری عمر میں آپ نے شعر و شاعری بالکل ترک کر دی تھی بلکہ کسی مشاعرہ میں بھی نہیں جاتے تھے آخری مشاعرہ جسمیں آپ تشریف لے گئے کلکتہ کا تھا جو ماہ اگست ۱۸۹۶ء میں ہوا جسمیں واجد علی شاہ کے پوتے شاہزادہ میرزا مقیم کے بلانے پر آپ تشریف لے گئے اس موقعہ پر کلکتہ میں بڑی دہوم دھام سے متواتر تین مشاعرے ہوئے اور تینوں مشاعروں کی طرحی غزلیں آپنے مجھے بھی عنایت فرمائی تھیں اسلئے دل نہیں چاہتا کہ پبلک کو اُن کے لطف سے محروم رکھوں مگر طوالت مضمون کا خیال مدنظر رکھکر صرف چند اشعار ہر ایک غزل کے ذیل میں درج کرتا ہوں:۔

آپ کا بچھانہ چھوڑا آخر اسی مرض میں دو چار روز مبتلا رہ کر ۲۱ - اکتوبر ۱۹۱۵ء مطابق ۴ - شوال ۱۳۳۳ھ کو بدھ کے روز رات کے بارہ بجے لکھنؤ میں رحلت فرما کے ہمیشہ کے لیے اِس جہان سے معدوم ہو گئے انا للہ وانا الیہ راجعون خداوند کریم سے دعا ہے کہ آپ کو جنت نصیب ہو اور پس ماندگوں کو صبر جمیل ملے آمین ثم آمین - اِس موقعہ پر کمترین نے جو چند قطعات تاریخ لکھکر دلی رنج کا اظہار کیا ہے وہ آیندہ پرچہ میں ہدیہ ناظرین کیئے جائیں گے ؁

راقم ادہم سنگ سردار

تلمیذ حضرت جلال لکھنوی - مرحوم

اعلان

تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ مخزن کی قسم سوم عام طور پر قبول نہیں ہوئی ہمنے تو چاہا تھا کہ اِس قسم کو تھوڑے بہت نقصان ہی سے جاری رکھیں لیکن اتنے عرصہ میں اشاعت کا محدود رہنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ناظرین مخزن ایک روپیہ کی خاطر قسم سوم کو قسم دوم پر ترجیح نہیں دیتے جس کا کاغذ بھی بہتر ہوتا ہے اور ہر ماہ ایک تصویر بھی ہوتی ہے ۔

اِس لئے ہم اِس سال قسم سوم بند کرتے ہیں - جن اصحاب کا چندہ وصول ہو چکا ہے آیندہ ان کو قسم دوم کا پرچہ بھیجا جائے گا امید ہے کہ وہ بقایا ایک روپیہ (عہ) بھیجکر ممنون فرمائیں گے ؁

منیجر

کلامِ اکبر

کم نظر آتی ہے اب وہ مسجد دنگے فرش پر
قوم نے اتنی ترقی کی کہ پہونچی عرش پر

راجہ اندر کے یہ جلسے بھی غضب کرتے ہیں
کہ پریزاد بھی اب ووٹ طلب کرتے ہیں

گرے جاتے ہیں ہم خود اپنی نظروں سے ستم یہ ہے
بدلجاتے تو کچھ رہتے مٹے جاتے ہیں غم یہ ہے
کہاں تک رشک اکبر ساقیِ بزمِ حریفاں پر
سنبھالو دلکو تم اپنے تمھارا جامِ جم یہ ہے

آرزو دنیا میں کب نکلی اولوا الابصار کی
چشمِ موسیٰ کو بھی حسرت رہگئی دیدار کی
دستِ گلچیں پھر رہا ہی شاخِ گل پر بیدریغ
کون سنتا ہی چمن میں عندلیبِ زار کی

انقلابِ مذاقِ طبائع

اب کہاں دستِ جنوں تارِ گریباں ایک ایک
پانیر اور دستِ مجنوں او خبر ہے تار کی
لیلیٰ شیریں نے کسرِیٹ میں ٹھیکہ دودھ کا
ریل بنوانے لگے فرہاد اب کہسار کی
شعر اب اکبر کے سن اے سامع عالی دماغ
قدر کرلے آسمان اس ابرِ گوہر بار کی

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

نرمی تری لامسہ کو پیاری — گرمی تری مدرکہ میں ساری

بوسہ ترا ذائقہ جو پا جائے — ہونٹھوں پہ مزہ شکر کا آ جائے

وعدہ ترا منتظر کی امید — رہنا ترے ساتھ عیش جاوید

پیدا کرے شرم تو دلھن میں — شوخی کو نہاں کرے بدن میں

نیچی نظروں میں ہو نہاں تو — اونچی چوٹی سے ہو عیاں تو

لائے جو دلھن خیال شوہر — تو دلنیں بنے جمال شوہر

شوہر کے خیال میں دلھن تو — بوئے تن و رنگ پیرہن تو

نظارے کا شوق دید تو ہے — تسلیم نظر میں عید تو ہے

اقبال ہے ساتھ ساتھ تیرے — دولت دنیا کی ہاتھ تیرے

تو تیغ کے ساتھ بنکے جوہر — تو بطن صدف میں بنکے گوہر

میدان تگ و دو جنوں تو — سلطان قلمرو فسوں تو

تو مستی عالم جوانی — تو ہستی لطف زندگانی

فہم حکما ہے دنگ تجھ سے — میدان خرد کا تنگ تجھ سے

محتاج رواج کا نہیں تو — ہے اصل میں حسن ہو کہیں تو

واجب نہ سہی وجود تیرا — ہے شاہد حق شہود تیرا

قبضہ ترا انتہا کی حد تک — موجود ازل سے تا ابد تک

تو طور پہ دعوے تعلی — تو برق میں قوت تجلی

کعبے کا خدا جمیل تجھ سے | بت دیر میں بے عدیل تجھ سے

آرائش شکل انجمن تو | زیبائش شاہد سخن تو

تو عشق کی روح چاہ کی جاں | دل کی حرکت نگاہ کی جاں

عاشق کا دماغ گھر ہے تیرا | دل ہے تیرا جگر ہے تیرا

تیری دعوت کو خون حاضر | بہلانے کو دل جنون حاضر

تو وصل سے باعث طرب ہو | تو فصل سے بانی تعب ہو

وہ ساز ہی کیا نہ تو ہو جس میں | آواز ہی کیا نہ تو ہو جس میں

تو رقص سے لوچ بنکے پیدا | چکرائے نظر ہو جسپہ شیدا

سب کہتے ہیں کچھ بلاس کیا ہے | میں کہتا ہوں تیری ہی ادا ہے

کیا کیا تجھے کہیے کس میں کس میں | اک لطف ہے تو ہر ایک حس میں

چڑیوں میں صدائے دل فریبی | پھولوں میں ادائے جامہ زیبی

شاخوں میں لچک میں خوشنما تو | کلیوں کی چٹک میں جابجا تو

معشوق کے ناز میں نہاں ہے | مژگان دراز سے عیاں ہے

رویت میں ہی تو ہی جان اوسکی | رفعت میں ہی تو ہی شان اوسکی

جادو سے اثر میں بڑھ کے ہے تو | بجلی سے چمک میں بڑھ کے ہی تو

سورج میں ہی تیرا روپ او حسن | سایہ تیرا ہے دھوپ او حسن

چمکا نام سحر تجھی سے | قدسے ہوئے جلوہ گر تجھی سے

سورج کی کرن نگاہ تیری | پیدا و نہاں میں راہ تیری

چاند ایک کرہ ہے اور کیا ہے | تو اوس میں ہی اس سے خوشنما ہی

زخموں سے ہے چور چور ہر پھول | لیکن ترے رنگ سے ہی مقبول

تو قوس قزح میں ہفت رنگی | تو چشم میں شوخی او رشنگی۔

شبنم

فقط ہے رات بھر کی اس چمن میں میہماں شبنم
سحر ہوتے جہاں سورج نکل آیا کہاں شبنم

غم و شادی میں تو ام دیکھ نیرنگِ چمن بلبل
ادھر گل خندہ زن ہیں اور اُدھر گریہ کناں شبنم

بلند و پست سب میں ہو اسی کی روشنی پھیلی
فلک پہ جلوہ گر تارے زمیں پر دُر فشاں شبنم

صبا اِتو نکہت گل کا بتاتی ہے پتا لیکن
بتا یہ بھی گئی بے بال و پر اُڑ کر کہاں شبنم

گل تازہ ہوا ہے کوئی پامالِ خزاں شاید
یہ کس کے سوگ میں ہیں بن رہے آنسو رواں شبنم

کہاں کامل کہاں ناقص کہاں دریا کہاں قطرہ
کہاں اعلیٰ کہاں ادنیٰ کہاں سورج کہاں شبنم

شفیق ابرِ کرم کا شامیانہ ہوگا تربت پر
چڑھائے گی لحد پر چادرِ آبِ رواں شبنم

شفیق عمادپوری

"ایک بیکس کا خواب"

تھک کے جب لیٹ گیا رات کو میں بستر پر
چٹکیاں لینے لگا دل میں خیالِ مادر

ہو گیا پیشِ نظر ماں کی محبت کا سماں
پھر گیا سامنے آنکھوں کے گزشتہ منظر

وہ مسرت کا زمانہ، وہ خوشی کی گھڑیاں
ہائے وہ انجمن عیش و طرب ہائے وہ گھر

غم کے آنسو بھی آنکھوں میں اگر آ جاتے
مردمِ دیدہ پکار اُٹھتے کہ "باہر باہر"

چپہ چپہ تھا مرے گھر کا مقامِ عشرت
ذرہ ذرہ تھا مکاں کا فلکِ شمس و قمر

نہ کسی رنج کا دھڑکا نہ الم کا کھٹکا
ہائے کس لطف سے ہوتی تھی بسر شام و سحر

تھا اسی طرح خیالات میں غلطاں پیچاں
درد اُٹھتا کبھی دل میں کبھی جلتا تھا جگر

اور ہی کچھ نظر آنے لگا عالم ناگاہ
اک نئی بھول بھلیاں میں تھا گم گشتہ دماغ
پہلے کچھ دھندلی سی تصویر نظر آنے لگیں
آنکھیں مل مل کے بہت غور سے دیکھا دیکھا
دیکھتا کیا ہوں کہ ہیں جمع خواتین کرام
وہ خواتین کہ جو باہر نہ نکلتی نہیں کبھی
بال کھولے ہوئے جنگل میں پڑی پھرتی ہیں
ہو کے بے چین وہ جب درد سے چلاتی ہیں
ہو گئیں بند مری خوف سے آنکھیں فوراً۔
سنسنی چھوٹ گئی جسم میں دل کانپ اٹھا
پھر کھلی آنکھ تو آئی نظر اک تازہ بہار
سامنے باغ ہے اور باغ بھی کیسا نایاب
شیخ نے چھوڑ دیا۔ جس کے لیئے دنیا کو
دودھ اور شہد کی بہتی ہیں کسی جا نہریں
جدھر اٹھتی ہے نظر۔ نور نظر آتا ہے
زینت بزم گلستاں ہیں خواتین کرام
اُن میں ہے مادر مرحوم بھی مجھ بیکس کی
ہو گئیں پیار بھری آنکھوں سے جب چار آنکھیں
دوڑ کر جوش محبت میں وہیں جا لپٹا
بیکسی دور ہوئی دل کے پھپھولے پھوٹے
ہائے تھی پیار کی نظروں میں عجب کیفیت

واہمے نے جو مرے حال پہ کی ایک نظر
سامنے آئے خیالات مجسم ہو کر
جن کے پہچاننے میں خیرہ تھی مشتاق نظر
اُٹھ گیا چشم سے یکلخت حجاب اکبر
گود میں ننھے سے بچے بھی ہیں با دیدۂ تر
غیر محرم کی کبھی جن پہ نہ پڑتی تھی نظر
پاؤں میں آہ نہ جوتی ہے نہ سر پر چادر
کانپ اٹھتا ہے وہیں عرش خدائے اکبر
خانۂ چشم سے باہر نہ نکلتی تھی نظر
رہ گیا صورت آئینہ میں ششدر ہو کر
دل کی پژمردہ کلی کھل گئی مثل گل تر
جس کی تعریف سے قاصر ہے ہر اک جن و بشر
جس میں رہتے تھے کبھی آدم و حوا اکثر
لہریں لیتا ہے کہیں چشمۂ آب کوثر۔
جگمگاتا ہے چمن وادی ایمن بنکر
جن پہ ہے سایۂ الطاف خدائے اکبر
وہی صورت۔ وہی نقشہ ہے۔ وہی ہیں تیور
دل نے چاہا کہ نکل جائے تڑپ کر باہر
ماں نے بھی کھینچ کے چھاتی سے لگایا کس کر
حسرتیں پاس سے منہ تکنے لگیں گھبرا کر
ہائے آغوش محبت تھا غضب کیف آور

پھر دیا پیار سے اک خوشۂ انگور مجھے — رکھ لیا زانو پہ مجھ بیکس و مغموم کا سر

عرض کی میں نے یہ رو کر مری پیاری اماں! — رنج فرقت کے سہے میں نے بہت شام و سحر

کیجئے اپنے جدا بہر خدا قدموں سے — رکھیئے چھاتی سے اسطرح مجھے لپٹا کر

ناگہاں شک نے ذرا سلسلہ جنبانی کی — ہو گیا گود سے ماں کی میں تڑپ کر باہر

لذت دید کا کیا لطف مٹایا شک نے — دل بیتاب نے تسکین نہ پائی دم بھر

پوچھا کیا مادر غمخوار تمہیں ہو میری؟ — کر[illegible] تھیں شام و سحر

تم مری ماں ہو یہ باور نہیں آتا مجھکو — ہائے مدت [illegible] کے سفر

ہنس کے فرمایا کدھر ہے ترا نادان خیال — کھول کر آنکھ ذرا دیکھ مرے نور نظر

ماں کو اک سال میں افسوس بھلایا دل سے — کیا یہی شرط محبت ہے؟ "ذرا دیکھ ادھر"

گر تجھے اب بھی ہے کچھ شک تو چلی جاتی ہوں — پھر نہ کہنا کبھی چھپتی ہیں" مادر مادر"

یہ کہا اور چلیں موڑ کے منہ۔ ہائے غضب — چل گیا بس دل محزوں کے گلے پر خنجر

ہائے امید نے پھر مجھکو دلایا یہ یقیں — شک کی باتوں پہ خبردار کبھی کان نہ دھر

فی الحقیقت یہ تیری ماں ہے۔ تو اسکا بیٹا — ہاتھ سے جانے نہ دامان خیال مادر

دل سے امید نے جب نقطۂ شک چھیل دیا — ہاتھ پھیلا کے بڑھا جلد میں سوئے مادر

دھندلی ہونے لگی تصویر محبت ہے ہے — مٹتے مٹتے نہ رہا کچھ بھی تو پھر اسکا اثر

آنکھیں پتھرائی ہوئیں رہ گئیں اک سکتہ میں — مردم دیدہ یہ کہنے لگے آنسو بہہ کر

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد — روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

بیکس احمد حسین نا امجد۔

کاش میں طائر ہوا ہوتا

کاش! میں طائر ہوا ہوتا — خوشنما اک پرند ننھا سا

میرے کندھوں پہ کاش لگے ہوتے　　ہائے! بازو سبک سے ہلکے سے

دل میں آتا خیال جب تیرا　　چاہتا میں وصال جب تیرا

شوق سے کھولتا پر پرواز　　سر کے بل کرتا قطع راہِ دراز

تیرے آرام گاہ پر پیارے!　　جا کے مٹ جاتے رنج فرقت کے

پر مجھے پر و بال کب حاصل!

میں ہی میرے خیال ہی باطل!

ہائے اے بیکسی یہاں ہوں میں　　المدد ضعف ناتوان ہوں میں

خیر ہنگام خواب اے جاناں!　　پاس ہوتا ہے تیرے طوطیاں۔

نیند میں اپنی مست ہے دنیا　　ہوش آیا اُلٹ گیا پردا۔

ہائے! پر کنج غم میں تنہا ہوں　　آنکھ سے بہ رہی ہے جوئے خوں

میں اکیلا ہوں میں اکیلا ہوں

آرزو کا فریب خوردہ ہوں

کوئی قیصر بھی التجا جو کرے　　خام امید! نیند کب ٹھہرے

پس طلوعِ سحر سے پہلے ہی　　مجکو خو پڑ گئی ہے اُٹھنے کی

نیند گرچہ ہے جا چکی میری　　آنکھ گرچہ ہے کھل گئی میری

لیک جب تک یہاں اندھیرا ہے

مجکو حاصل ترا نظارا ہے

بند آنکھیں کیئے ہوں لیٹا ہوا　　دید میں واہ! کیا مزا دیکھا

روز تیرا خیال کرتا ہوں

اے تصور! میں تجھ پہ مرتا ہوں

شیخ غلام محمد طور۔

تازہ غزلین

وہ خوش کہ ہے جگر کو نظر میں لیے ہوئے
میں خوش کہ ہوں نظر کو جگر میں لیے ہوئے

آیا ہوا عدم سے تو بزمِ وجود میں
آئے میں وہ عدم کو کمر میں لیے ہوئے

زلفوں سے دل کو پھینک بھی دو ورنہ عمر بھر
بیٹھے رہو گے درد کو سر میں لیے ہوئے

کہتے ہیں وہ حیا سے پسینے میں ڈوب کر
ہے کوئی مجھکو دیدۂ تر میں لیے ہوئے

وسعت ہمارے عشقِ جنوں زا کی دیکھنا
دنیا کے حسن کو ہے یہ سر میں لیے ہوئے

جو تم نے دی نسیم کو۔ اور وہ ہے کوچہ گرد
ہم کو ملی تھی۔ رہگذر میں لیے ہوئے

کیا **شوق** اسی پہ چرخِ تنک ظرف کو ہے کبر
ایک اشرفی ہے جیبِ سحر میں لیے ہوئے

احمد علی شوق قدوائی

ایک نے نامۂ وحشت نہ ہمارا دیکھا
ہم تو محشر کو یہ سمجھے کوئی میلا دیکھا

کبھی زخمی کبھی بسمل کو تڑپتا دیکھا
کوچۂ یار میں جا کر یہ تماشا دیکھا

جی کا جنجال ہوا زلف کا پھندا دیکھا
ہم نہ سمجھاتے تھے کیوں او دلِ شیدا دیکھا

یوسفستاں ہے خیالاتِ حسیناں سے یہ دل
چشمِ مشتاق میں پریوں کا تماشا دیکھا

دل پہ کیا چوٹ لگی دیکھ کے آئینے کو
اپنی زینت کا مزا تو نے خود آرا دیکھا

اپنے بیمار سے رہتا ہے کوئی یوں غافل
آنکھ بھر کے نہ کبھی تو نے مسیحا دیکھا

پاؤں رکھنا ہوا دشوار گلی میں اوسکی
دلِ عشاق کو ہر جا پہ تڑپتا دیکھا

سرو قمری میں ترے حسن کا افسانہ ہے
گل و بلبل کی زباں پر ترا چرچا دیکھا

واعظا چشمِ حقیقت تو ذرا پیدا کر
ہم نے تو دیر میں اللہ کا جلوا دیکھا

کیا بیتابی دل سے ہوا طوفاں برپا
صیدؔ آنکھوں سے بہا خون کا دریا دیکھا

کس طرح پڑیں تم پہ نہ خلقت کی نگاہیں　　آفت کی ادائیں ہیں قیامت کی نگاہیں

تو وہ ہے بنا کر تجھے رخ سے ترے ہرگز　　ہٹتی ہی نہیں صانع قدرت کی نگاہیں

بس میں دل زاہد نہ رہا دیکھ کر اس کو　　للچا ہی گئیں آج تو حضرت کی نگاہیں

ہے حسن بھی کیا چیز کہ جاتے ہیں جدھر وہ　　تعظیم کو اٹھ جاتی ہیں خلقت کی نگاہیں

تڑپا دیا ان کو بھی کسی نے دم آخر　　وہ یاس کی تقریر وہ حسرت کی نگاہیں

رنجش میں بھی بھولا ہوں نہ بھولوں گا میں **عاصی**

وہ پیار کی باتیں وہ محبت کی نگاہیں

یا الٰہی آج کیسی گردش قسمت ہوئی　　وصل کی شب میرے گھر آ کر شب فرقت ہوئی

آج آنکھوں مجمع عشاق سے نفرت ہوئی　　قدر شے رہتی نہیں باقی جہاں کثرت ہوئی

یاد میری تیرے دل میں تھی کبھی یادش بخیر　　مدتیں گزریں نہیں معلوم کیا صورت ہوئی

اک ادائے ناز تھی ظالم پشیمانی تیری　　حشر میں بے چین خود اللہ کی رحمت ہوئی

میری الفت تیرے دل میں ہائے جا کر مر مٹی　　جو کدورت تھی بھری اس میں وہی تربت ہوئی

ایسی جلدی کیا ہے جانا یہ بھی کوئی بات ہے　　میرے پہلو میں جہاں بیٹھے تمہیں وحشت ہوئی

دل میں جب آتے ہیں یہ مہمان پھر جاتے نہیں　　آرزو تیری ہوئی ارمان ہوا حسرت ہوئی

اب بھی دعویٰ ہے نظر بازی کا یا جاتا رہا　　کوئی پوچھے حضرت موسیٰ سے کیا حالت ہوئی

دخت رز کی تاک میں ایسے ہی آ جاتے ہیں پاک　　دیکھ کر واعظ کو میخانے میں کیوں حیرت ہوئی

اب کہاں اگلا سا ملتا ہے شرر بیکار وقت

کہہ لیے دو چار ہم نے شعر جب فرصت ہوئی

شرر کاکوری۔

کتبہ احقر ابو ظفر حامد میرزا دہلوی

ادیب

جنوری سنہ ۱۹۱۰ء سے ایک ماہوار رسالہ جسکا عنوان پر درج ہے زبان اردو کی ادبی خدمات کی غرض سے شائع کیا گیا ہے جسمیں ادبی اخلاقی تاریخی تنقیدی اور دیگر علمی مضامین کے علاوہ ہر مرتبہ ایک رنگین اور چار سادی عکسی تصاویر ہوتی ہیں لکھائی چھپائی کاغذ اور ہر قسم کی خوش سلیقگی کیلئے اسیقدر کہنا کافی ہے کہ یہ رسالہ انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوتا ہے جو اپنی اعلیٰ چھپائی اور وسیع کیلئے تمام ہندوستان میں مشہور ہے ایڈیٹری کیلئے منشی نوبت رائے صاحب نظر منتخب کئے گئے ہیں جنہیں اردو کے نفیس اور ادبی پرچوں کی اشاعت میں خاص مہارت ہے تصاویر کا انتظام دو بسنتی مصوروں کے سپرد ہے جنکی زیر نگرانی نہایت اعلیٰ مشین کام کرتی ہے مضمون نگاری کیلئے ملک کے نامور اہل قلم نے خاص توجہ مبذول فرمائی ہے اسطرح یہ رسالہ خاص خوبیوں کا مجموعہ ہے شائقین علم ادب اور حامیان اردو سے درخواست کیجاتی ہے کہ اسکی خریداری کے لئے دست شوق بڑھائیں مہلت سے کام لیں بڑی تقطیع کافی حجم اور پانچ اعلیٰ درجے کی تصاویر کیساتھ اسکی قیمت صرف چار روپیہ (للعہ) سالانہ مقرر ہے مع محصول نمونہ فی پرچہ

المشتہر

منیجر ادیب الہ آباد

انڈین پریس الہ آباد

طب یونانی کی بقا کیلئے
خط کا ٹھیک پتہ
مینیجر ہندوستانی دواخانہ دہلی
تار کا کافی پتہ